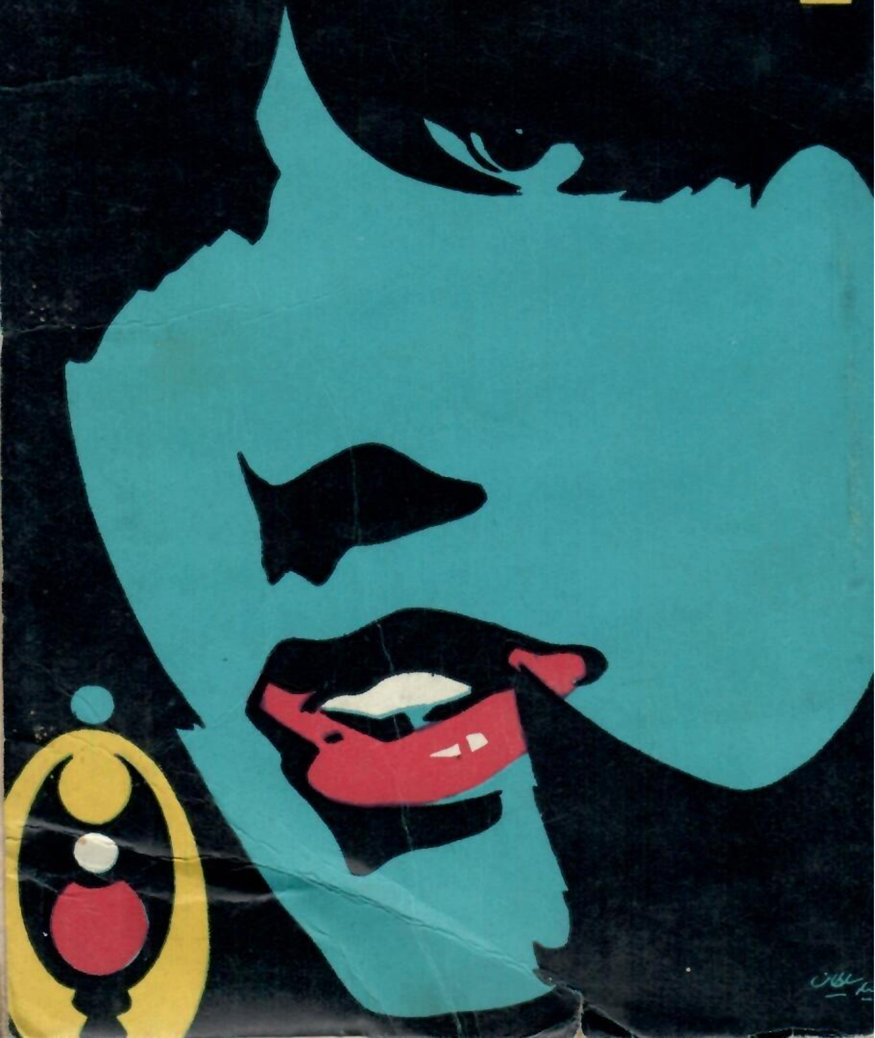
پورٹریٹ

رحیم گل



20/2

حافظ محمد کمال الدین ایم-اے - ایل ایل بی
بی - ایڈ
۲۷ ستمبر ۱۹۸۴ء

محمد کمال الدین

یونیورسٹی بک ایجنسی
خیبر بازار۔ پشاور

رحیم گل

پورٹریٹ

(خاکے)

مکتبۂ ارژنگ، پشاور

کوائف نامہ

پہلی بار —— ۱۹۷۹ء

تعداد —— ایک ہزار

طابع —— فنون پریس لاہور

ناشر —— آذر تاج سعید

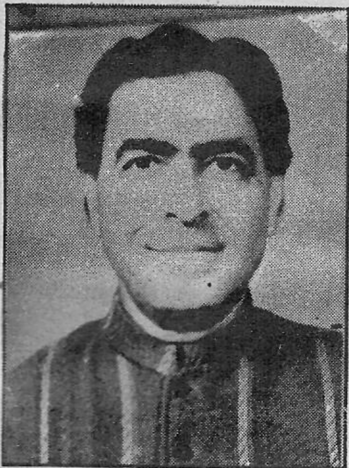
مکتبۂ ارژنگ، ظہیر آباد، پشاور

سرورق —— سعید سلطان خٹک

خوشنویس —— شمس العارفین

ابتدائی صفحات —— کشش

قیمت —— دس روپے



رحیم گل
شکردرہ کوہاٹ

۱۹۲۴ء

دوسری تصانیف

- تن تارا را
- پیاس کا دریا
- زہر کا دریا
- وہ اجنبی اپنا
- داستاں چھوڑ آئے
- جنت کی تلاش میں

ترتیب

ان دوستوں کے نام

جن کا ذکر

اس کتاب میں نہیں

ہے۔

رحیم گل

ابتدائیہ

میرے یہ مضمون کچھ ذاتی قسم کے ہیں۔ ذاتی مضامین کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح چلا۔ کہ لاہور کا ایک ادبی حلقہ معروف افسانہ نگار محترمہ امّ عمّارہ کے ساتھ ایک تقریب منا رہا تھا۔ اس تقریب کی صدارت جناب احمد ندیم قاسمی کو کرنا تھی۔ اور نہایت اہم ادیب ان کے فن پر مقالے پڑھ رہے تھے۔ مگر حلقے کو لاہور میں کوئی ایسا ادیب نہ ملا۔ جو امّ عمّارہ کی شخصیت پر مضمون لکھتا۔ لہٰذا قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ——

میں نے لاکھ عذر کئے۔ کہ دیکھو بھائی، امّ عمّارہ سے صرف میری ایک ملاقات ہوئی ہے۔ وہ بھی بالکل گھریلو قسم کی، تاج سعید کے ساتھ ایک بار ان کے گھر گیا تھا۔ اب ایک ملاقات میں کوئی کیا لکھے گا — لیکن پھانسی کا رسّہ تو میرے گلے میں فٹ ہو چکا تھا —— مرتا کیا نہ کرتا

مضمون گھسیٹ ڈالا۔ اور ڈرتے جھجکتے مائیک پر آ گیا۔ بڑے بڑے جغادری جغادری قسم کے ادیب بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ میری ٹانگیں کانپ رہی ہوں گی ـــ

اللہ کا نام لیکر مضمون پڑھنا شروع کیا۔ مگر سامعین سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ مضمون آگے بڑھا۔ جانے کیا پتے کی بات منہ سے نکل گئی۔ کہ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ میں نے پہلی بار نگاہ اٹھائی پورے ہال کی آنکھیں روشن تھیں۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے پاؤں زمین پہ جمے ہوئے ہیں۔ اور میں معمولی آدمی نہیں ہوں ـــ بس پھر کیا تھا۔ میری گردن تن گئی۔ اور میری آواز میں تھرتھراہٹ کی بجائے طنطنہ آگیا۔

تقریب ختم ہوئی۔ تو داد کے وہ وہ ڈونگرے برسے۔ کہ من چل تھل ہو گیا۔ اور دوستو۔ میں خاکہ نگار بن چکا تھا ـــ اور سچ پوچھئے۔ تو خاکہ نگاری کی ایسی چاٹ پڑی۔ کہ اب تک کئی دوستوں کے خاکے لے اڑا ہوں۔

جناب محمد طفیل نقوش والے سے کسی نے کہا۔ دیکھو۔ یہ اُجڈ پٹھان تمہارے منہ لگ رہا ہے۔ طفیل صاحب زیر لب مسکرائے۔ بولے "چیونٹی کی موت آتی ہے۔ تو اس کے پَر نکل آتے ہیں!"

تو دوستو، آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ میرے پر نکل آئے ہیں۔ ورنہ تو آج آپ سے مخاطب ہونے کا شرف کیونکر حاصل ہوتا۔

موت آئے۔ وہ تو آئے گی۔ لیکن میں نے طے کر لیا ہے۔ کہ موت کے پہنچنے سے پہلے جس حد تک ممکن ہو گا۔ دل کھول کر دوستوں کی تعریف کروں گا۔ حالانکہ میں اُس پگڑی اُچھال شہر سے آیا ہوں۔ کہ بقول شخصے، بچ کر نہ جانے پائے۔!

جناب مبارک احمد کی نثری شاعری کو آپ مانیں نہ مانیں مگر ایک بات انھوں نے بڑے پتے کی کہی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ وہ صبح سے ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ اور رات گیارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ جو لوگ دن میں دو چار بار ٹی ہاؤس میں جھانکنے کے عادی ہیں۔ مبارک احمد کو مستقل ایک میز پر براجمان دیکھ کر چونکے۔ کسی من چلے نے صبح سے رات گئے تک بیٹھنے کا سبب پوچھا۔ تو بولے۔ "اس ٹیبل پر صبح سے شام تک جتنے شاعر ادیب آتے جاتے رہے ہیں۔ آنے والے کی خوبیاں اور جانے والے کے عیب بھی گنے جاتے رہے ہیں۔ میں اس لئے اُٹھ کر نہیں جا رہا۔ کہ جانے کے بعد میری بدخوئی شروع ہو جائے گی۔!"

تو دوستو — یہ ہے آج کا جدید ڈیفنس۔

میرا اپنا تجربہ بھی مبارک احمد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ــــ ایک بار میں نے عدم صاحب کی معصومیّت کی داستان سنائی (جو واقعی معصوم آدمی ہیں) تو یار لوگ بولے ـ "چھوڑو بھی، شاعر کو اتنا احمق نہیں ہونا چاہیئے ـ" میں نے قتیل کا ذکر کیا ـ کہ بلا کا ذہین و فطین آدمی ہے ـ تو فوراً جواب ملا ـ "چھوڑ یار، شاعر کی شان چوکسی میں نہیں قلندری میں ہوتی ہے!ـ جناب حفیظ جالندھری کا نام لیا، تو فرمایا "جماعت اسلامی کا آدمی ہے ـ!"

جناب فیض کا ذکر آیا تو الزام لگایا ـ "روس کا آدمی ہے ـ حب الوطنی مشکوک ہے ـ!"

حب الوطنی کی رعایت سے میں نے جناب احمد ندیم قاسمی کی تعریف کی ـ تو فوراً ٹوکا ـ "جانے دو یار ـ قاسمی سرمایہ دار ہو گیا ہے ــ! سرمایہ داری کی وساطت سے جناب وزیر آغا کا ذکر ہوا ـ تو بُرا سا منہ بنا کر بولے ـ "بورژوا سماج کی آخری نشانی ہے!"

منیر نیازی کا نام لیا ـ تو بھڑک اٹھے ـ "کہ شاعرانہ تعلّی کا مریض ہے!" احمد فراز کا ذکر ہوا ـ تو بولے "شاعر کو خودسری نہیں حلیمی زیب دیتی ہے ـ!" ــ میں نے کہا ــ انشا جی بڑے حلیم الطبع ہیں ـ فرمایا "چین جائیں تو چینی، امریکہ جائیں، تو امریکی ـ!" میں نے جمیل الدین

عالی کا نام لیا۔ تو بولے۔" نیشنل بنک زندہ باد" میں نے کہا۔ شوکت صدیقی۔؛ فوراً بولے۔" جوڑ توڑ کا بادشاہ!" میں نے کہا مختار مسعود؟ کہنے لگے۔ محمد خالد اختر سے پوچھئے۔" میں نے کہا مسعود مفتی۔؟ کہنے لگے۔" آدمی شریف ہے مگر برین واشنگ ہو گئی ہے!" میں نے کہا، خالد عبد العزیز۔؟ فرمایا۔" آدمی وہ بھی شریف ہے۔ مگر برین واشنگ ہونا باقی ہے!" میں نے کہا۔" برگیڈیئر شفیق الرحمٰن؟ کہنے لگے۔" حفیظ مراتب کا اسیر ہے۔" میں نے کہا۔ بسلامت روی وباز آئی۔؟ فرمایا۔" جنگ آمد، بس وہ پہلا اور آخری معرکہ ہے!" میں نے کہا۔ انتظار حسین۔؟ بولے،" ماضی کے کھنڈر!" آخر میں نے تنگ آ کر کہا۔ رحیم گل؟ تو نفرت سے بولے۔" دفع کرو۔ محض فلمی آدمی ہے۔!"

— یہ ہے ایک دوسرے کو رد کرنے کا انداز، لیکن میرا دل گردہ دیکھئے۔ کہ لاہور سے اسلام آباد آگیا ہوں: تاکہ زیتون بانو کی شان میں قصیدہ کہوں۔ حالانکہ جو کچھ کر رہا ہوں۔ اصولاً غلط کر رہا ہوں۔ اس صدی میں دوسرے کی تعریف کرنا گویا اپنی ذات کی نفی کرنا ہے۔ لیکن آپ میری ٹیکنیک کو نہیں سمجھتے۔ دوسرے کی تعریف کے آڑ میں اپنی انا کے مینار بھی تو کھڑے کرتا ہوں۔ اور اگر دوستوں

کی نحو بیاں مبالغے اور طمطراق سے سُناتا ہوں۔ تو اُن کی خامیوں کا ذکر بھی ایسے لطیف پیرائے میں کر جاتا ہوں۔ کہ اس دور کے ایک فرد کی حیثیت سے اس صدی کی منافقت میں بھی شریک کار ہو جاتا ہوں۔ میرے خبثِ باطن کی تسلّی بھی ہو جاتی ہے۔ اور احباب اُسے مذاق سمجھ کر پی جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں نے فنیل شفائی کا خاکہ اڑایا۔ اسرار زیدی کا زائچہ بنایا۔ تو لوگ عش عش کر اٹھے۔ زیتون بانو اور تاج سعید کے ہاتھ کی لکیریں بھی دیکھیں۔ احوال بیان کیا۔ تو لوگوں نے میری بات کو سچ جانا۔ حالانکہ سچ یہ ہے۔ کہ میں ایک فیصد سچ بولتا ہوں۔ اور باقی نائنٹی نائین پرسنٹ جھوٹ اپنے دوست ابراہیم نفیس کی نذر کر دیتا ہوں۔!

نائنٹی نائن کی اصطلاح کا ذکر بھی سن لیجیے۔ ابراہیم جلیس جب کبھی بہت اہم موضوع پر بے حد سنجیدہ گفتگو میں مصروف ہوں۔ (جو غالباً وہ کبھی نہیں ہوتے) تو آپ آہستے سے کہہ دیجیے ـــ " نائنٹی نائین!"

بس پھر ابراہیم جلیس ایک فلک شگاف حیدر آبادی قہقہہ لگائیں گے اور معصومیت سے کہیں گے ـــ " اچھا تو آپ بھی جانتے ہیں۔

یعنی اُن کے جھوٹ کی پرسنٹ ایج کو۔!

میرا خیال ہے۔ خاکہ نگاری میں جھوٹ سچ کا امتزاج کچھ ایسا غیر مناسب بھی نہیں ہے۔ کیونکہ سو فیصد سچ ہاضمے کیلئے "تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ورنہ تو جناب ممتاز مفتی سے پوچھ لیجئے۔ جو وہ اشفاق فیملی کے لئے روا رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے محترمہ بانو قدسیہ کی کتاب کی تقریب میں بانو قدسیہ کی شخصیت پر ایک زور دار مضمون پڑھا تھا۔

مگر اس میں سچ کی اتنی بھر مار تھی۔ کہ سامعین کے علاوہ خود اشفاق احمد پہلو بدل رہے تھے۔ اور بانو قدسیہ کا اضطراب تو خیر دیدنی تھا۔ خود ممتاز مفتی کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ کہ حد سے متجاوز سچ بالآخر جھوٹ بن جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ہٹلر کا پروردہ گوبلز بار بار جھوٹ بول کر اُسے سچ بنا دیتا تھا۔

تو دوستو اس لئے کہتا ہوں۔ کہ میرا رویّہ بہت معقول ہے۔ ایک دن آئے گا۔ میرا جھوٹ سچ کی طرح جگمگائے گا۔ جس طرح میں فن میں مبالغے کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اسی طرح خاکہ نگاری میں سچ کو نیمبو کی طرح نچوڑنا اور جھوٹ کو غبارے کی طرح پھیلانا درست سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میرے خاکے بڑے جاندار ہوتے

ہوتے ہیں۔ اور اب اپنے منفرد فن سے آپ کو مرعوب کرنے کیلئے یہ کتاب لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ بُرا نہ مانیئے گا۔ کہ میں خودستائی پر اُتر آیا ہوں۔ کیونکہ ادیبانہ تعلّی کا حق ہر ادیب کو ہوتا ہے۔ آپ مجھے بڑا ادیب نہیں مانیں گے۔ نہ مانیں،

میں تو اپنے آپ کو خوردبین سے دیکھنے کا حق رکھتا ہوں۔!

۔حرف آغاز کچھ طویل ہو گیا ہے —

لیکن میں آپ کو زیادہ بور نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے محترم ممتاز مفتی کی طرح طویل مضموں لکھنے کا عارضہ نہیں ہے۔ (یہ الزام میں نے اپنی طرف سے نہیں لگایا۔ خود ممتاز مفتی صاحب نے لاہور میں اپنے اس مرض کی تشخیص کی تھی۔)



باہر کے رابطے، اندر کے رشتے

عام طور پر ندیم صاحب سے میرا رابطہ بہت کم رہتا ہے۔ مگر جہاں تک ذہنی اور قلبی رشتے کا تعلق ہے۔ اس کی عمر ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ ہے — ندیم صاحب ساٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں اور میں ہاف سنچری سے ایک دو منزلیں ادھر کھڑا ہوں۔ مگر ہمارے تعلق خاطر کا معصوم بچہ مکمل طور پر جوان ہو چکا ہے۔

ندیم صاحب کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں۔ جب اپنے آپ کو نہیں جانتا تھا — اپنے آپ کو جانا۔ تو مجھے ندیم صاحب کو بھول جانا چاہیئے تھا مگر وہ تو پلٹ کر میرے دل میں بیٹھ گئے۔

جب میں باجرے کے کھیت کے منڈیر پر پاؤں پھیلا کر ندیم صاحب کے افسانے پڑھتا تھا۔ تو ایک چھم چھم کرتی ہوئی لڑکی، ہرے بھرے باجرے کے کھیت سے جھانکتی نظر آتی تھی — یہ ندیم صاحب کے افسانوں کا اثر تھا

کہ پنجاب کی الھڑ مٹیار میرے ذہن میں بُری طرح بیٹھ گئی تھی۔

یہ کریڈٹ بھی ندیم کو جاتا ہے۔ کہ بالآخر میں اس الھڑ مٹیار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور آج وہ باجرے کے کھیت میں سے جھانکتی ہوئی مٹیار میرے بچوں کی ماں ہے۔

اور یہ ڈس کریڈٹ بھی ندیم صاحب کو ہی جاتا ہے۔ کہ ایک بار ان کے افسانے کے نشے میں اس قدر سرشار ہو گیا تھا کہ منڈیر پہ لیٹے ہوئے سانپ پر بے خبری میں ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا۔ اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ مگر اس ڈس کریڈٹ سے ایک کریڈٹ بھی جنم لیا تھا سانپ کے زہر نے میرے جسم میں داخل ہو کر میری فطرت کے زہر کو مار ڈالا تھا —!

بعض اوقات ان کے افسانوں کے ایکسپریشن سے متأثر ہو کر میں ورق پلٹ کر ان کی تصویر دیکھتا۔ کہ اس شخص نے کیسے کیسے خوبصورت عشق کئے ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر ایسی شرافت، اور آنکھوں میں ایسی طہارت نظر آتی۔ کہ متزلزل ہو جاتا۔ اور سارے الزامات واپس لے لیتا۔

میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔ جب میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھی تھی — یہ سچ ہے کہ میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھ کر ان کی شخصیت سے قربت محسوس کی تھی — جس طرح بعض لوگوں کی

شکلیں دیکھ کر اُن سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجھے ندیم صاحب سے خدا واسطے کی محبت ہو گئی تھی ۔ دیکھا ہے ۔ لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں۔ کہ ندیم صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ اور بڑے شاعر ہیں ۔ افسانہ نگاری محض بہتان ہے ۔ اور بعض انہیں بنیادی طور پر افسانہ نگار کہتے ہیں۔ بڑا افسانہ نگار ۔

میں اپنی بات بتاؤں ۔ میں جب تک لاہور نہیں آیا تھا ۔ انہیں افسانہ نگار ہی سمجھتا رہا ۔ لاہور آکر انکشاف ہوا ۔ کہ وہ تو شاعر بھی ہیں اور چند گنے چنے شاعروں میں سے ایک ۔ مثلاً یہ شعر بھی ندیم صاحب کا ہے ۔

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

ندیم کوئی میرے فن کا اجر کیا دے گا
کہ خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں

تب مجھے ان کے افسانے کنجری، سنّاٹا، گنڈاسہ یاد آئے ۔ اور میں فیصلہ نہ کر سکا ۔ کہ ندیم صاحب شاعر بڑے ہیں۔ یا افسانہ نگار بڑے ۔ ؟ اخبار نویس بڑے، مدیر بڑے، اور یا انسان بڑے ۔ !؟

اس شہر میں اور اس ملک میں کتنے لوگ ہیں جن کے متعلق دعوے کیا جا سکے ۔ کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے۔ تحقیق کریں تو پھر اسی سے لے کر

ملک کے صدر تک میں کوئی نہ کوئی عیب نکل آئیگا۔ لیکن ایک شخص
اس "ہ" سے باہر تنہا کھڑا ملے گا۔ جس کے دامن پر کوئی معاشرتی، سیاسی
اور اخلاقی داغ نہیں ملے گا اور اس کی روشن پیشانی پر جلی حروف میں پیرزادہ
احمد شاہ لکھا ہوگا ۔۔!

اگر یہ شخص مجھے انیسویں صدی میں ملتا اور میرا نام رحیم گل کی بجائے
رحیم گل خان ہوتا۔ تو میں بلا دریغ اس شخص کو اغوا کر کے وزیرستان
پہنچا دیتا۔ اور پورے قبائل کو جمع کر کے نذرانۂ عقیدت کے طور پر
انہیں شہید کر دیتا۔ اور پھر ساری زندگی ان کے مزار کا مجاور بن کر گزارتا ۔۔!

لیکن یہ زار روس کی انیسویں صدی نہیں ہے۔ یہ الیگزینڈر سولزنیٹسن کی بیسویں
صدی ہے۔ اس سولزنیٹسن کی، جو کینسر کا مریض تھا جس نے نہ صرف کینسر
جیسے موذی اور ناقابل شکست مرض کو شکست دی بلکہ سنگینوں کے ہالے میں
اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔

پس اگر الگزینڈر سولزنیٹسن کو روسی سماج کا ضمیر کہتا ہوں۔ تو
احمد ندیم قاسمی کو پاکستانی سماج کا ضمیر کہوں گا ۔۔!

یہ نہ سمجھئے ۔ کہ دو متضاد نظریوں کے نمائندہ آدمیوں کو داد دے
کر میں کنفیوژن پیدا کر رہا ہوں ۔ بیشک راہیں الگ الگ ہو سکتی ہیں
لیکن وہ سچ، جو انسانی ضمیر سے عبادت ہے۔ اس کے دو ٹکڑے نہیں

ہو سکتے۔

سچ تو سچ ہوتا ہے۔ وہ گنگارام کے سینے میں ہو، یا ولیس منتھائی کے سینے میں، اور یا دین محمد کے سینے میں، اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ کوئی نسل نہیں ہوتی۔ کوئی مذہب نہیں ہوتا۔۔ وہ باہر کی نہیں۔ اندر کی چیز ہوتی ہے۔!

یہ اندر کی چیز میں نے سولزنیٹسن میں محسوس کی تھی۔ یہ اندر کی چیز میں نے احمد ندیم قاسمی کے سینے میں دیکھی ہے ۔۔۔ یہ اندر کی چیز تھی جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا۔ یہ اندر کی چیز تھی۔ جو سولزنیٹسن کو وطن بدر کر گئی ۔۔ یہ اندر کی چیز ہے، جو احمد ندیم قاسمی کی پیشانی پر ساٹھ سال سے جگمگا رہی ہے۔

تو دوستو۔۔ میں جو ایک سیدھا سادہ پٹھان ہوں۔ میں جو کسی ادبی گروہ کا آدمی نہیں ہوں ۔۔ نہ نقوش کا، نہ اوراق کا، نہ فنون کا، اور نہ سیپ کا، میں ان سب کا آدمی نہیں ہوں۔ مگر میں ان سب کا آدمی ہوں ۔۔ کیونکہ میرے پاس کوئی اوزان نہیں ہیں۔ کہ آپ کو بتاؤں ۔۔۔ میں کس سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔ اور کس سے کتنی محبت کرتا ہوں ۔۔ بات یہ ہے کہ جو نفرت کے قابل ہیں۔ میں تو ان سے بھی نفرت نہیں کرتا لیکن جو محبت کے قابل ہیں۔ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں۔ میں جن سے

ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک نام احمد ندیم قاسمی کا ہے ۔!

اگر یہ جانبداری ہے تو مجھے یہ الزام قبول ہے۔ اگر اس الزام کے تحت کوئی گروہ مجھے ادیبوں کی فہرست سے خارج کرتا ہے۔ تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔ لیکن مجھے یہ منظور نہیں کہ کوئی مجھے ندیم صاحب کی محبت سے باز رکھے۔

یہ دَور جو ایک دوسرے کو رَد کرنے کا دَور ہے۔ یہ صدی جو انتشار کی صدی ہے۔ اس میں اگر اتفاق سے مجھے دو چار آدمیوں کی محبت میسر آئی ہے تو میں ایسا بیوقوف کیوں بنوں گا کہ اس محبت کو کھو دوں گا۔

اگر اسرار زیدی کی طرح مجھے عارف عبدالمتین اچھا لگتا ہے۔ اگر عدم کیلئے میرے دل میں بے پناہ جذبات ہیں۔ اگر عطاء الحق قاسمی میں مجھے قربت کا احساس ملتا ہے اور اگر خالد احمد جیسے فتنے سے بھی میں پیار کرتا ہوں۔ تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں دوستو۔ یہ تو اندر کی بات ہے ۔!

اور بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں میں پیار کرتا ہوں لیکن فہرست طویل ہو جائے گی۔ اور میں نفس مضمون سے ہٹ جاؤں گا۔

تو یہ طے ہوا ۔ کہ ندیم صاحب میرے ہیں۔ اتنے زیادہ میرے، کہ شاید ناہید ندیم کے بھی نہ ہوں گے۔ نعمان ندیم کے بھی نہ ہوں گے ۔ یہ معاملہ تو بس میں ہی جانتا ہوں۔ بے چارے ندیم صاحب کیا جانیں ۔ !؟

اس عقیدت و احترام کی بنیادیں بڑی ٹھوس اور گہری ہیں۔ دیوارِ چین کی طرح مضبوط، اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اسے کوئی حملہ آور عبور نہیں کر سکتا۔

خدا واسطے کا پیار اپنی جگہ۔ کہ وہ اندر کی بات ہے۔ میں باہر کی باتیں بتا کر بھی ثابت کر دوں گا۔ کہ جس نے ندیم صاحب کو نہیں پہچانا۔ وہ شخص عرفان سے خالی ہے۔ اس عرفان سے خالی، جس سے پرندہ اپنے گھونسلے کی طرف لوٹتا ہے۔۔۔!

مجھے یاد ہے۔ آج سے ٹھیک تیس برس پہلے، جب میں نے داتا کی نگری میں قدم رکھا تھا۔ تو نہایت سرشار دل لیکر آیا تھا۔ اُن لوگوں کے لئے میرے دل میں ایک عجیب جذبہ موجزن تھا جن کی کتابیں میں نے باجرے کے کھیت کے منڈیروں پر پڑھی تھیں۔ میرے معصوم دل اور کچے ذہن نے سوچا تھا۔ وہ کیسے کیسے لوگ ہوں گے جنہوں نے موتیئے کی کلیوں کی طرح الفاظ چن چن کر شعر پروئے ہیں ـــ کیسے کیسے خوبصورت لوگ ہوں گے۔ میں ان کے نیاز حاصل کروں گا۔ ان کی قربت کے احساس سے جھولیاں بھروں گا۔ موقع ملا تو آنکھ بچا کر موتیئے کی کلیاں چراؤں گا۔ اور اپنے فن کا آنگن آباد کروں گا۔ لیکن اس شہرِ بے پرساں میں جہاں شاعروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ ہے۔ مجھے وہ شاعر نہ ملا۔

جس نے الفاظ کی کلیوں سے میرے ذہن و شعور کو معطر کر رکھا تھا۔ وہ ادیب بھی نہ ملا جس نے میری روح میں محبت کے بھر بھر جام انڈیلے تھے۔

میں نے چند لوگ دیکھے۔ نفرتوں کے میلے پیرہن پہنے ہوئے، میکلوڈ روڈ کے چائے خانوں میں ادبی حلقوں میں اور ٹی ہاؤسوں میں، جو میری طرح ناشتہ کرتے تھے۔ اور پلیٹ میں سب سے اچھی بوٹی پر ندیدوں کی طرح جھپٹتے تھے اور ایک دوسرے کی برائیاں کرتے تھے ـــ

یوں میرا شیشۂ دل ٹوٹ گیا۔

وہ مافوق الفطرت شاعر اور ادیب کا تصوّر جو میرے کچّے ذہن نے بنایا تھا بکھر بکھر کر رہ گیا ـــ اب مجھے خوف آنے لگا۔ وہ چند نام جو میرے سینے میں محفوظ تھے۔ میں انہیں دیکھنے اور ملنے سے کترانے لگا۔ یہ اندیشہ کہ کہیں وہ بھی میری طرح گوشت پوست کے آدمی نکل آئے، تو میرا کیا بنے گا۔

اس فہرست میں سب سے پہلا نام ندیم صاحب کا تھا۔ پورے دو سال اپنے آپ پر جبر کئے رکھا۔ اور ان سے ملنے کے مواقع عمداً ضائع کرتا رہا۔

میرے دل میں ندیم صاحب کیلئے جو محبت اور احترام تھا۔ مجھے پسند نہیں تھا کہ اس میں ذرّہ بھر کی بھی کمی آئے۔ میں انہیں دوسرے لوگوں کی سطح پہ دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ آخر مجھے بھی تو کسی آسرے

اور سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ انسان کی ہستی محض نفرت سے عبارت نہیں ہے۔ اور یہاں اگر محبّتوں کی فراوانی نہیں ہے تو محبتوں کا یکسر فقدان بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں کیکر کے تا حدّ نظر پھیلے ہوئے جنگل میں آم کے پیڑ کی تلاش جاری رکھتا ہوں۔ پیڑ ملے نہ ملے — کم از کم میرے تصوّر میں تو یہ پیڑ موجود ہے۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے یہ تصوّر بہت تقویّت پہنچاتا ہے۔

آخر ایک دن منیر نیازی کھینچے کھینچے مجھے میکلوڈ روڈ سے ہسپتال روڈ کی طرف یہ کہہ کر لے گیا — "کہ آج تم ایک خوبصورت آدمی سے ملاقات کروگے۔!"

میں نے کہا "تم کم خوبصورت ہو گیا — ؟"

بولے — "وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے —!"

یوں ہم دفتر امروز کی سیڑھیاں طے کر کے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچ گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا — یہ تو وہی شخص تھا جس کی تصویر میں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں دیکھی تھی اور جس کے چہرے سے شرافت اور آنکھوں سے ظہانت جھلکتی تھی —

منیر نے تعارف کرایا — "یہ ہیں ندیم صاحب اور یہ ہے رحیم گل!"

ندیم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر کہا ــــ "ہاں میں انھیں جانتا ہوں!"

میں چونکا۔ یعنی یہ شخص مجھے جانتا ہے۔ یقین کرو دوستو، میں بالکل بدحواس ہو گیا۔ مجھ جیسے بے نام و گم نام آدمی کو ندیم صاحب جانتے ہیں۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ واقعی میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اب بھی کیا ہوں۔ مگر آج سے اکیس برس پہلے کون جانتا تھا مجھے۔!

مگر ندیم صاحب مجھے جانتے تھے ــــ دراصل لاہور میں یہ میری پہلی پہچان تھی۔ میں نے ککر کے جنگل میں آم کا پیڑ پا لیا تھا۔ مجھے وہ شاعر بھی مل گیا۔ جسے میں نے تصور کے ریشمی غلاف میں چھپا رکھا تھا۔

اب حقیقت میرے سامنے تھی۔ ایک مافوق الفطرت ــــ وجود بن کر مجھ سے مخاطب تھا۔ اور میں خوش تھا۔ کہ مجھ پر عظمت انسانی کا ایک عقدہ وا ہو گیا تھا۔

تب مجھے قرآن کی وہ بات یاد آ گئی۔ کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ یقیناً دنیا کے وہ نائب مجھ جیسے لوگ نہیں، ندیم صاحب جیسے لوگ ہوتے ہیں۔

میر نیازی باتیں کر رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ ہاں میں انہیں جانتا ہوں!"

اس چھوٹے سے جملے میں کیا بھید تھا۔ کہ میری روح کھل اٹھی تھی۔
دراصل اس فقرے کے بطون میں ایک عظیم آدمی کی پہچان کی خوشبو رچی بسی تھی۔

وہ دن اور یہ دن، میں نے ندیم صاحب پر کبھی شک نہیں کیا۔ ان کی اس ادا سے میں ہمیشہ کیلئے ان کا گرویدہ بلکہ غلام بن گیا تھا۔

ندیم صاحب جب سے سمن آباد منتقل ہوئے ہیں۔ باقاعدگی سے عید ملنے جاتا ہوں۔ گذشتہ سے گذشتہ عید کا ذکر ہے۔ نماز عید کے بعد گھر واپس آیا۔ بچوں سے عید ملا۔ اور ندیم صاحب سے عید ملنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا بڑا بیٹا عدیم عادل، جس کی عمر تقریباً گیارہ برس ہے۔

بولا — "ابو آپ کہاں جا رہے ہیں —"

میں نے کہا "ندیم صاحب کے پاس۔"

کہنے لگا "وہی نا۔ جو ٹی وی پر کبھی آتے ہیں۔ ؟"

میں نے کہا "ہاں وہی۔

کہنے لگا — میں بھی ان سے ملوں گا۔"

میں نے کہا "یہ تو ثواب کا کام ہے۔ چلو۔"

عید ملنے کے بعد واپس آنے لگے۔ تو ندیم صاحب نے عدیم عادل کو دس روپے عیدی پکڑا دی —

میں نے راستے میں عدیم عادل سے پوچھا — "تم ندیم صاحب کو دیکھنے گئے تھے۔ یا عیدی لینے گئے تھے ؟"

وہ شرمندہ و محجوب پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھنے لگا۔

ایک عید آئی۔ میں ندیم صاحب سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ عادل سے پوچھا "کیوں بھئی۔

ندیم صاحب سے عید ملنے نہیں جاؤ گے۔ ؟

لڑکے نے ذو معنی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا "نہیں وہ مجھے پھر عیدی پکڑا دیں گے !"

تو دوستو — کیا کیا جائے۔ کہ بچے، جوان سے بڑوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ ندیم صاحب انہیں مٹھائی کھلا کر نا راض کر دیتے ہیں۔ ان کی اس عادت سے بعض بڑے لوگوں کو بھی شکایت ہے۔ کہ وہ ہر آدمی کے ساتھ اتنا میٹھا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ کہ رقابت دب جاتی ہے اور احترام سامنے آجاتا ہے — ؟

کیا بتاؤں — ایں سعادت بزور بازو نیست۔

دوستوں اور غیروں سے ان کے شریفانہ رویے کی ایک مثال اور سنیئے۔

نام یاد نہیں، کئی برس اُدھر کی بات ہے۔ ایک عرب ادیب

پاکستان آیا تھا۔ اُن کے اعزاز میں کئی تقاریب بھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ میں کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اخباروں میں خبریں پڑھتا رہا۔ اس سلسلے میں روزنامہ مشرق میں جناب انتظار حسین کا کالم پڑھا۔ تو مجھے یہ عرب ادیب مسخرہ لگا۔ لیکن دوسرے ہفتے روزنامہ جنگ میں ندیم صاحب کا کالم پڑھا تو یہ عرب ادیب مجھے واقعی دانشور لگا۔

تب معلوم ہوا۔ کہ حقیقتیں کس طرح افسانے بن جاتے ہیں۔ !

اور تب یہ راز بھی کھلا۔ کہ جو لوگ دوسروں کو احترام دیتے ہیں۔ دراصل خود ہی محترم ہوتے ہیں۔۔۔ !

ایک بات اور بتاؤں۔۔۔ یہ وہ دَور ہے۔ کہ اگر آپ میری تعریف کریں۔ تو مجھے حیرت کے ساتھ آپ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ تاکہ آپ کا دل گردہ دیکھ کر اندازہ کر سکوں۔ کہ اس کا وزن اور حجم کتنا ہے۔ کیونکہ عام ہوا یہ ہے کہ آج کل دل گردے سکڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کو نہیں مانتا۔ کسی کی عظمت تسلیم نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی بھولا بھالا شخص کسی کو تسلیم کرلے۔ تو ظاہر ہے۔ آپ اس کا دل گردہ دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

تو بتا دوں۔ ایک بھولا بھالا شخص اس غریب بستی میں موجود ہے بلکہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ ندیم صاحب ہیں۔

میرا دوسرا ناول "پیاس کا دریا" مکمل ہوا۔ دیباچے کے لئے میں

نے دو چار مشہور ادیبوں سے رابطہ پیدا کیا۔ انھوں نے اس کی حامی بھی بھری سال چھ مہینے مسودہ بھی رکھا۔ لیکن دیباچہ نہ لکھا گیا۔ میں اس قسم کے سلوک کی توقع کم از کم ان شرفا سے نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ بھی غالبًا مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے۔ کہ اُن کے رویے سے میں کسی طرح کا ردّ عمل دوں گا۔

اب صرف ندیم صاحب ہی تھے۔ کہ دیباچے کے لئے اُن سے رجوع کرتا۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ہمت یوں نہیں پڑتی تھی، کہ ندیم صاحب سے مجھے بے پناہ عقیدت تھی۔ بے پناہ محبت تھی۔ میں ڈر رہا تھا۔ کہ اگر انہوں نے بھی دوسرے دوستوں کی طرح ٹال مٹول سے کام لیا۔ تو میرا کیا بنے گا۔ میں اپنی عقیدت کا جنازہ کہاں کہاں اٹھائے پھروں گا۔ ظاہر ہے۔ کہ میں بکھر جاؤں گا۔ ٹوٹ ٹوٹ جاؤں گا۔!

لہٰذا، یہ ندیم صاحب سے میری انتہائے محبت تھی۔ کہ ان کی طرف نہ گیا۔ لیکن عرضِ مصنّف کے کھاتے میں جہاں میں نے ان شرفاء کے سلوک کا ذکر کیا۔ وہاں ادیبانہ تعلّی کا شعار ہو کر، یا یوں کہیئے کہ انتقامًا اپنے ناول کی خود تعریف کی تعریف بھی یہاں تک کہ جس موضوع پر میں نے ناول لکھا ہے اسے جناب مرزا ادیب نہ لکھ سکتے تھے حتیٰ کہ ندیم صاحب بھی اس موضوع پر مجھ سے اچھا نہ لکھ سکتے ۔۔۔ بلکہ ایسا ناول لکھنا میرا ہی مقدر تھا ۔۔۔!

کچھ لوگوں نے اس غلط بینی یا خود بینی پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ کہ کم از کم

مجھے ندیم صاحب کے خلاف زہر نہیں اگلنا چاہیئے تھا۔ لیکن میری ڈھٹائی اور دیدہ دلیری دیکھیئے۔ کہ جب اس ناول کی تقریب کا اہتمام ہوا۔ تو میں نے صدارت کے لئے ندیم صاحب کا نام لیا۔ سب لوگ چونکے ـــ مگر میں جانتا تھا ـــ میں ندیم صاحب کی عالی ظرفی کو ان سے زیادہ جانتا تھا ـــ

ندیم صاحب نے اس تقریب کی صدارت قبول کی۔ انھوں نے صدارتی خطبے میں جو کچھ کہا۔ یار لوگ اسے سن کر دنگ رہ گئے ـــ انہوں نے کہا ـــ

یہ ناول پڑھ کر میں ذہنی طور پر پہلے سے زیادہ امیر ہو گیا ہوں۔ یہ رحیم گل کے کہانی کہنے کا کمال ہے۔ کہ چار سو صفحے کے اس طویل ناول کو ایک نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اور رحیم گل کا یہ دعویٰ سچ ہے۔ کہ ایسا ناول لکھنا کسی اور کا نہیں، رحیم گل کا مقدر تھا!''

تو دوستو ـــ یہ ہیں ندیم صاحب ـــ جو لوگ بڑے لوگوں کو پہچاننے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ تعصب کی عینک اتار کر اس پٹھان کی آنکھوں سے دیکھیں۔ تاکہ انہیں ندیم صاحب کا بے مثال روپ نظر آئے ـــ!

ان کے دل گردے کی ایک بات اور سن لیجئے ـــ پچھلے دنوں میں نے اپنا ایک ناول مکمل کیا۔ "جنت کی تلاش" اس کا موضوع ایسا تھا

کہ مجھے پاکستان کے گوشے گوشے کی سیاحت کرنا پڑی۔ اس ناول کو لکھنے میں چھ سال لگے ظاہر ہے۔ بہت محنت طلب اور صبر آزما کام تھا یہ۔

اب کے میں نے طے کر لیا تھا۔ کہ دیباچہ ندیم صاحب سے لکھواؤں گا حالانکہ انہی دنوں ایک اخبار میں خبر چھپی تھی۔ کہ کثرت دیباچہ نویسی سے ہار کر ندیم صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ندیم صاحب تو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور پھر سب سے اہم بات یہ تھی۔ کہ میں نے جس ذوق و شوق سے یہ ناول لکھا تھا جتنے بڑے موضوع کو زیر بحث لایا تھا۔ اس کی تنقید و تبصرہ کے لئے بھی کسی بڑے دل گردے کے ادیب کی ضرورت تھی۔ کیونکہ کسی کے حق کو تسلیم کرنا، کسی کو جائز داد دینا نہایت حوصلے کا کام ہے۔ خصوصًا اس دور میں کسی کے لئے کلمۂ خیر کہنا آسمان سے تارے توڑ لانے کے مترادف ہے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ اس ملک میں خدا کا ایک بندہ ایسا موجود ہے جس کے منہ میں سچ کی زبان ہے۔ جس کے فراخ سینے میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا ہے۔ اور جس کے قلم سے روشنائی کی بجائے موتی ٹپکتے ہیں ——

جب میں نے اس ضخیم ناول کا مسوّدہ ندیم صاحب کے حوالے کیا۔ تو وہ ہنس پڑے۔ ان کی خوبصورت ہنسی سے میری چھ سال کی محنت سپھل ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا۔ ندیم صاحب نے کسی سے کہا۔

"جنت کی تلاش" ایسا ناول ہے جس کا دیباچہ میں رسمی طور پر نہیں لکھوں گا بلکہ قارئین کو اپنے ایک لطیف تجربے میں شریک کروں گا۔ ا"

تقریباً سال سوا سال کے بعد جب ندیم صاحب نے دیباچہ میرے حوالے کیا۔ میں نے دیکھا۔ ندیم صاحب کا کہا ہوا۔ فقرہ دیباچے میں بھی درج تھا۔ میں سامعین کو اپنی مسرت میں شریک کرتے ہوئے اور ندیم صاحب کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اس دیباچے کا شروع اور آخر کا مختصر سا اقتباس سناتا ہوں۔

ندیم صاحب لکھتے ہیں۔

"جنت کی تلاش" اردو زبان کا پہلا ناول ہے جس میں وہ گہری اور گمبھیر الجھنیں موضوع بنی ہیں۔ جنہوں نے صدیوں سے بڑے بڑے حکیموں، فلسفیوں، داناؤں اور دانشوروں کو جستجوئے مسلسل میں مبتلا رکھا ہے۔ اس بہت بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کو رحیم گل نے ایک ماسٹر کرافٹسمین کی طرح شروع سے آخر تک اپنی پُر اعتماد گرفت میں رکھا ہے اور ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے۔ جو اپنے موضوع اور نوعیت اور بُنت کے لحاظ سے کم از کم اردو زبان میں تو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ ا"

آخر میں وہ لکھتے ہیں ـــ

"مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ نقد نے دیانت سے کام لیا تو وہ جنت کی تلاش

کو ایک ایسا ناول تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو اپنے موضوع اور برتاؤ کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اور جو مستقبل کی اردو ناول نگاری کی ایک مضبوط بنیاد قرار پا سکتا ہے!"

تو دوستو — یہ ہے وہ حوصلہ مند شخص، جسے شاید معلوم نہیں کہ میرے ناول "جنت کی تلاش" کا ایک کردار، سکہ دو کا ڈاکٹر، درحقیقت ندیم صاحب کا کردار ہے وہ چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ پاؤں میں سپرنگ لگے ہوئے ہیں اور وہ دیکھتے دیکھتے آسمان کی طرف پرواز کر جائے گا — زندگی سے اس کا سلوک، انسانوں سے اس کا برتاؤ، اور بیوی سے اس کا سمبندھ ساری خصوصیتیں میں نے ندیم صاحب سے چرا کر اپنے کردار کو ودیعت کر دی ہیں اگرچہ یہ کردار ناول کے آخری باب میں انٹر ہوتا ہے، مگر ناول کے تمام کرداروں کو متاثر کرتا ہے۔ بالکل اس طرح، جیسے ندیم صاحب نے اپنے ادبی اور شخصی کردار سے ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔

سامعین کرام — مضمون ختم کرنے سے پہلے میں اپنی آخری خواہش کا اظہار کر دوں۔ کہ جب ندیم صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ منائی جا رہی ہو۔ تو میں ایک بار پھر مضمون پڑھوں — اور جب ندیم صاحب اپنی بے مثال زندگی کے ایک سو سال پورے کر لیں۔ تو میرا وہ بیٹا جو ان کی محبتوں سے خوف زدہ ہے، باپ کی جگہ اسٹیج پر آ کر اس عیدی کا ذکر اس انداز میں کرے کہ محبت کا خوف، جوان ہو کر

کس طرح، محبّت کی انتہا میں بدل جاتا ہے۔ اور نسل در نسل کس طرح محبت کا چراغ روشن رہتا ہے۔



بانکا شاعر

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع نہیں کیا تھا لیکن مطالعے کا یہ عالم تھا۔ کہ چھپا ہوا ردّی کاغذ کا ٹکڑا ابھی ہماری دست برد سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے کہ لڑکپن گزرا چاہتا تھا۔ اور جوانی دستک دے رہی تھی۔ کہ کوئی چیز ہمیں اندر ہی اندر چھیڑ رہی تھی۔ اور اپنی ہم عمر لڑکیوں سے محبتیں کرنے کو اکساتی رہتی تھی۔ ایسے میں ہمیں ان رسائل کی تلاش ہوتی تھی جن میں غزلیں چھپتی تھیں۔

لیکن غزل کو پڑھنے کا طریقہ ذرا مختلف تھا ہم لوگ مطلع سے غزل شروع نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مقطع سے پڑھنے کا آغاز کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں اپنی محبوباؤں کو شعر سے مخاطب کرنے کا جنون ہوتا تھا چونکہ آخری شعر میں جسے مقطع کہا جاتا ہے۔ شاعر کے تخلّص سے مزیّن

ہوتا تھا۔ اس لئے اکثر مقطع ہی ہمارا مشق سخن بنتا تھا۔ ہم بیک اشارہ ابرو شاعر کا نام کاٹ کر اپنا نام لگا دیتے تھے۔ اور شعر اپنے شکار پر پھینک دیتے تھے۔ اگر تیر نشانے پر لگتا۔ تو شاعر کے کمال فن کے فوراً قائل ہو جاتے۔ ورنہ یہی کہ بس یونہی سا شاعر ہے۔ ایک جوان لڑکی کے جذبات میں گدگدی پیدا کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔!

تو سامعین کرام ۔۔ یہ جو آپ کے سامنے بانکا شاعر بیٹھا ہے۔ غالباً آپ کی طرح یہ بھی نہیں جانتا۔ کہ ہم نے ان کے کتنے مقطع مشق سخن بلکہ مشق ستم بنائے ہیں۔ اور نادان لڑکیوں کو رعب سخن میں پھانسا ہے ۔۔ تو اگر اس سلسلے میں ہمارے دائیں بائیں کے فرشتوں نے ہمارے نامۂ اعمال کو سیاہ کر رکھا ہو۔ تو ہم ان سے کہیں گے۔ کہ ان کو بھی پکڑو۔ جن کے کندھے پر ہم نے بندوق رکھ کر چلائی تھی ۔۔!

تو دوستو ۔ یہ تھا میرا اس بانکے شاعر سے پہلا تعارف، میں تو اس تعارف کو خوشگوار ہی کہوں گا۔ کیونکہ آہستہ آہستہ میں نے اس شاعر کی غزلیں مقطع کی بجائے مطلع سے پڑھنا شروع کر دی تھیں ۔ اور کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ گویا سرگوشیوں میں الھڑ دوشیزاؤں سے محو گفتگو ہوں۔

پھر ایک دن کسی رسالے میں اس بانکے شاعر کی تصویر دیکھی جو سیدھی میرے دل میں اتر گئی۔ یقین آ گیا۔ کہ جو کچھ میں نے پڑھا تھا۔ اس کے تیور بھی

ہو بہو اس شوخ تصویر جیسے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ شعر اور شاعر بالکل ہمشکل تھے۔

چونکہ شروع سے ہی قلم اور ادب سے لگاؤ تھا۔ اس لئے فلمی جرائد اور ادبی رسائل کا برابر مطالعہ رہتا۔ میں نے یہ نام جسے برصغیر میں لوگ قتیل شفائی کے نام سے جانتے ہیں، ہر دور میں اسی طرح زندہ و تابندہ پایا۔ اگر کبھی یہ نام صفت روزہ اداکار کے ادارتی صفحے پر نظر آیا۔ تو اس وقت کے ادب لطیف کی ادارت میں بھی یہی نام نظر آیا۔

پھر ایک انکشاف ہوا۔ کہ اس شاعر کا اصل نام اورنگ زیب ہے اور یہ ہری پور ہزارے کا رہنے والا ہے۔ خوشی اور حیرت سے میری باچھیں کھل گئیں۔ حیرت اس بات پر کہ یہ تو اپنا پٹھان نکلا۔ اور خوشی اس بات پر کہ ہم نے ابھی شاعری ترک نہیں کی۔ جیسا کہ غالب نے بادشاہوں کے سلوک سے تنگ آ کر شاعری کو ذریعۂ عزت ماننے کے بجائے پیشہ سپہ گری کی تعریف کی تھی۔ چونکہ اب بادشاہوں کا زمانہ نہیں رہا۔ کہ استادشہ کی وجہ سے غالب جیسے استادفن نظرانداز ہوتے رہیں۔ اس لئے بحیثیت سرحدی کے میں نے قتیل کی شاعری کو وجۂ افتخار سمجھا۔

اگر دوسری جنگ عظیم نہ ہوتی۔ اور شوق سیاحت مجھے برما اور ہمالہ کے جنگلوں میں نہ لے جاتا۔ تو میں اس بانکے کو ضرور تلاش کرتا۔ جو اپنی

غزلوں کے خوبصورت مقطع لکھ لکھ کر ہمارے کام آ تا رہا تھا۔

جنگ ختم ہوئی۔خیر سے بدھو گھر کو آئے۔پاکستان بننے کے چرچے سنے۔با قاعدگی سے اخبار پڑھنا شروع کیا۔معلوم ہوا کہ ہم تو با قاعدہ لیڈر بن گئے ہیں۔چنانچہ "نظر بد دور" چند سال جواں سال لیڈر کہلائے۔لیکن بات نہ بنی۔ہمیں تو اپنا بانکا شاعر یاد آ رہا تھا۔جو بلبل ہزار داستان بن کر لاہور میں چہک رہا تھا۔

انہی دنوں کسی رسالے کے مدیر نے میرا افسانہ شائع کر دیا۔بس پھر کیا تھا۔فوراً پر لگ گئے۔اور یہ مغالطہ کہ اب تو ہم مسلّمہ اور مصدقہ ادیب ہیں۔لاہور جائیں گے تو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لئے جائیں گے۔ہم کہانی لکھیں گے۔فیشنل نغمے لکھیں گے۔پری وشوں کے جھرمٹ ہوں گے اور بڑے ہی مزے ہوں گے۔یوں اس شہرِ نا پرساں کی طرف چل پڑے۔

لیکن دوستو۔۔۔کیا بتائیں۔کہ داتا کی نگری نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا۔کسی شخص نے بھی بزعم خود اس عظیم افسانہ نگار کو گھاس نہ ڈالی۔مارے مارے پھرتے رہے۔وہ بانکا شاعر بھی جو ہر موقع پہ ہمارے کام آتا رہا تھا۔مدد کو نہ پہنچا۔

دراصل میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔اور اب سوچ رہا تھا کہ لاکھوں کے شہر میں جہاں کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔اگر بانکے شاعر نے

بھی جس سے میرا لڑکپن سے ذہنی رابطہ ہے ۔ نہ پہچانا ۔ تو میں کہیں کا نہ رہوں گا ۔

دوستو لیکن مجھے بابر یا تیمور کی وہ کہانی بھی یاد تھی ۔ کہ چیونٹی ننانوے بار گرنے کے بعد آخر دیوار پر چڑھ گئی تھی ۔ لہٰذا میں نے لاہور نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا کیونکہ آگے دشمن تھا پیچھے سمندر، اور کشتیاں جل چکی تھیں ۔ چنانچہ اس قوتِ ارادی کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا ۔ میں ایک فلم کمپنی میں بھرتی ہو گیا ۔ میرے استاد بڑے باکمال شخص تھے ۔ اور اس زمانے میں انور کمال کے نام سے ان کا طوطی بولتا تھا ـــ

مجھے یاد ہے ۔ ایک گانے کی سیچوایشن پھنس گئی تھی ۔ بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ۔ لیکن بات نہ بنی ۔ مجھے اپنا بانکا شاعر بار بار یاد آ رہا تھا ۔ کہ آخر اُسے کیوں نہیں بلایا جاتا ۔ ایک تو یہ خواہش، کہ اسے دیکھ لوں گا اور دوسری یہ کہ پھنسی ہوئی سیچوایشن کا مسئلہ حل ہو جائے گا ۔

معلوم ہوا۔ کچھ ناچاقی ہے۔ آخر ایک دن تنگ آکر پاشا صاحب نے کہہ ہی دیا۔

"یار قتیل کو بلاؤ"

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن قتیل نہ آیا۔ اور پھر اس کے نہ آنے پر خوشی یوں ہوئی۔ کہ چلو پٹھان تو نکلا۔ ہٹ کا پکّا۔!

آخر کار قتیل کو منا لیا گیا۔ قتیل آ گیا —— ارے صاحب، بالکل وہی تصویر والا قتیل، وہی اپنے شعر کا ہم شکل، گندمی رنگ، چمکتی ہوئی پیشانی گھنے گھنگریالے بال، (یہ اب کی نہیں تب کی بات ہے) یعنی بیس اکیس سال پہلے کی۔

مجھے یہ شخص بیحد اچھا لگا۔ صرف اچھا ہی نہیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ جن لوگوں کے لئے کامیابی مقدر ہو چکی ہو۔ ان کی پیشانیوں کی ساخت دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی دن مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا۔ کہ میں شکلیں دیکھ کر ادیبوں کے مستقبل کی پیش گوئیاں کر سکتا ہوں۔ اپنی اس اہلیت کا علم مجھے بانکے شاعر کو دیکھ کر ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کہ پاشا صاحب کا سلوک بھی اس خوش ادا شاعر سے خاصا مختلف تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ کہ استادِ مکرّم کو اس آدمی کی اہمیت اور ضرورت کا شدید احساس ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جب

کا خدشہ تھا۔ اس شاعر خوش نوا نے اس سیچوایشن پہ ایسا گانا لکھا۔ کہ پا شا صاحب پھڑک پھڑک اٹھے ۔۔۔ مجھے فوراً اپنے لڑکپن کا وہ دور یاد آ گیا۔ جب اس شاعر کے دل کی واردات کو ہم نے لڑکیوں پر آزمایا تھا۔ پاشا صاحب کو بھی اس بانکے جادوگر نے جکڑ لیا تھا۔

اس کے بعد شریف نیر نے ایک فلم شروع کی جس کا نام معصوم تھا۔ اس معصوم فلم کے گانے اور مکالمے لکھنے کے لئے تین غیر معصوم آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ اس مثلث میں قتیل کے علاوہ میں اور ابراہیم جلیس بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میں جرعہ جرعہ احساس کمتری سے احساس برتری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن ان دو ذہین و فطین معصوموں کے سامنے میرا چراغ نہ جل سکا۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ اچھا دوستو، کبھی تو ہمارا بھی زمانہ آئے گا!

اور جب زمانہ آیا۔ میں ہدایت کار بن گیا۔ تو گن گن کر قتیل سے بدلے لئے۔ اور اپنے کسی بھی فلم کے گانے اُن سے نہ لکھوائے۔ لیکن اب سوچتا ہوں۔ تو محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ انتقام ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ صاف احسان فراموشی تھی ۔۔۔ میں نے جوانی میں ان کے شعروں سے کیا کیا اور کیسے کیسے فائدے اٹھائے تھے۔ لیکن یہ عجیب و غریب

شخص جب بھی ملتا۔ ماتھے کے شکن کے بغیر ملتا۔ اور میں دل میں سوچتا۔ یہ کیسا سخت جان آدمی ہے۔ مجھ سے گلہ بھی نہیں کرتا ــــ یوں اس شخص سے ذہنی رابطے کے ساتھ ساتھ قلبی رابطہ بھی پیدا ہو گیا۔ اور میں دل ہی دل میں اس کا احترام کرنے لگا۔

سامعین کرام ــــ اتنی باتیں کہنے کے باوجود میں آپ کو ایک ضروری اطلاع بہم پہنچا دوں۔ کہ اتنے مراسم اور تعلقات کے باوجود صحیح معنوں میں ہم ایک دوسرے کا قرب حاصل نہیں کر سکے تھے۔

میں جوان کا احترام کرتا تھا۔ نہیں جانتا تھا۔ کہ ان کے دل میں میرے لئے کیا ہے۔ کیونکہ نہ میں بہت بڑا ہدایت کار تھا۔ نہ نامی گرامی ادیب تھا۔ اور نہ مالی لحاظ سے آسودہ حال آدمی، کہ میرا نوٹس لیا جاتا۔ اور لوگ مجھے دوست بنا کر فخر محسوس کرتے۔ جبکہ قتیل کا بڑا نام تھا۔ اور ان کے دستر خوان کا تو دور دور تک چرچا تھا۔

لیکن ایک دن مجھے اچانک اطلاع ملی۔ کہ قتیل میری تلاش میں ہے۔ وہ ایک پشتو فلم بنانا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے انہوں نے مجھے بطور مصنّف اور ہدایت کار منتخب کر لیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ صحیح کام کے لئے صحیح آدمی کا انتخاب ہمارے ملک میں اور خصوصاً ہماری ٹریڈ میں بہت کم کم ہوتا ہے۔ خود کو صحیح آدمی کہہ کر ممکن ہے میں نے

ادیبانہ تعلّی سے کام لیا ہو۔ لیکن قتیل کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے نہایت ہی غیر جانبدارانہ اور فنکارانہ تھا۔ کیونکہ پشتو کی یہ فلم عجب خان قبل ازیں اردو میں بھی میں نے ہی لکھی اور بنائی تھی۔ چنانچہ اس طرح میں قتیل کے دستر خوان تک جا پہنچا۔ اور صحیح معنوں میں ہم نے ایک دوسرے کے دلوں میں جھانکا اور ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خوبیوں کو پایا۔ اور پھر ایک دوسرے کو قبول کیا۔

ان دو چار سالوں میں میں نے جس طرح قتیل کو پایا۔ اس کا ذکر خطرے سے خالی نہیں۔ یوں سمجھئے۔ کہ اس ذکر سے اپنی ہیٹی ہوتی ہے۔ مثلاً اُن کے ساتھ رہنے اور گھومنے میں اگر طرح طرح کے ڈائقول اور کام و ذہن کے مزوں سے لطف اندوز ہونا پڑتا ہے۔ تو وہاں اس نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ کہ بازار کا ہر دکاندار اور سڑک کا ہر راہی انہی کی طرف انگلی اٹھائے گا۔ "وہ دیکھئے قتیل جا رہا ہے!"

اگر آپ اپنی شخصیت کا یہ نقصان برداشت کرنے پر راضی ہیں۔ تو ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ضرور چلئے۔ کیونکہ نقصان کے ساتھ ساتھ فائدے بھی ڈیوڑھے ہیں۔ یعنی نہ صرف یہ کہ آپ کا حلقہ احباب وسیع ہوگا۔ بلکہ قتیل ہر قدم پر سوچے گا۔ کہ اپنے

ہمدردش کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ یہ ان کی خوبی نہیں ان کی سرشت ہے۔ دوستوں کے لئے اچھی باتیں سوچنا شعوری کوشش نہیں۔ بلکہ ان کے خون میں رچی بسی سچائی ہے۔

چونکہ قتیل بے ڈھب قسم کا بے باک آدمی ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے ان کے نیچر کو سٹڈی نہ کیا ہو۔ وہ اس بے ڈھبے پن کو ان کی ذہنی کج روی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سطحی قسم کے لوگ ان کی صاف گوئی سے گبھرا کر ان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ قتیل کو جب ان کی دشمنی کا علم ہوتا ہے تو وہ قدرتی طور پر حیران ہوتا ہے۔ کیونکہ واقعتاً یہ ان کا دشمن نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں خود میں بھی قتیل کے اس طرح کے رویّے کو جارحیت سمجھتا رہا۔ بلکہ ایک طرح کا ادبی استحصال۔ لیکن دھیرے دھیرے میں نے ان کی فطرت کی لطافت کو پالیا۔ اور یوں میرا دکھ ختم ہو گیا۔

دراصل قتیل اس قدر بھرپور اور ذہین آدمی ہے۔ کہ بہت سے لوگ ان کی ذہانت سے گھبرا کر ان سے دور چلے جاتے ہیں۔ لیکن بھاگنے والوں سے زیادہ ہجوم اُن لوگوں کا ہوتا ہے۔ جو ان کی ذہانت سے آب لیتے ہیں۔ اور مقناطیس کی طرح ان کی شخصیّت کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔

میں جہاں ان کی ذہانت اور فطانت کا قائل ہوں۔ وہاں ان

کی فطری سادہ لوحی کا بھی بے حد قائل ہوں مثلاً شعر و ادب میں ان کی ذہانت اگر ریشم کی طرح ملائم اور دو دھاری تلوار کی طرح کاٹ رکھتی ہے۔ تو بزنس میں ان کی سادہ لوحی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً میں نے جوان کی پشتو فلم عجیب خان بنائی تھی۔ یہی دو ڈھائی لاکھ کی فلم ہوگی۔ مگر اس فلم کا صرف فرنٹیئر کا بزنس پانچ لاکھ سے اوپر تھا۔ لیکن قتیل کو اس میں سے ایک پائی بھی نہ ملی۔ اور نہ ملنے کی توقع ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں۔ کہ جس قدر خوبصورت شعر کہنے کی ان میں اہلیت ہے۔ بزنس میں ٹھگے جانے کی ان میں اس سے زیادہ صلاحیت ہے۔ بارہ سال کا سنار بچہ چاندی پر سونے کا پانی چڑھا کر ایک منٹ میں ان کی جیب خالی کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے۔ کہ اقتصادی آسودہ حالی آتی ہے۔ اور انہیں چھو کر نکل جاتی ہے۔ قتیل کی ایک اور خوبی جو ان کی بیگم کی زبان سے سنی ہے۔ وہ یہ کہ قتیل تجربے بہت کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ لوگ روپیہ کماتے ہیں۔ قتیل تجربے کماتے ہیں۔ !

مثلاً یہ کہ جب ان کی پشتو فلم ہٹ ہوئی۔ تو انہیں فوراً دوسری پشتو فلم شروع کر دینا چاہیئے تھی مگر انہوں نے پشتو کی بجائے ہندکو کا تجربہ کیا۔ خدا کرے ہندکو ہٹ ہو جاتی تو پھر یہ پنجابی ہماری کا تجربہ کریں گے۔ آخر ضمیر تو ایک شاعر کا ہے۔ وہ کام

کیوں کریں گے جس میں ڈھیروں روپے آنے کا احتمال ہو۔ اور وہ کام کیوں نہ کریں گے جس میں روپے کے عذاب مصرف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ اور قلم ہاتھ سے نہ چھوٹے۔!

تو دوستو۔ یہ ہیں قتیل کی خوبیاں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ قتیل میں خامیاں نہیں ہیں۔ گنوں تو پوری ایک سو ایک، لیکن کاغذ بہت مہنگا ہے۔ اور آپ کا وقت بہت قیمتی۔ اس لئے اختصار سے کام لینا میرا فرض ہے کہ اس میں ہم سب کا بھلا ہے۔

تو سامعین کرام۔ اب ذرا دل تھام کے بیٹھو۔ کہ یوم حساب آگیا ہے تعریف بہت ہو چکی۔ اب میں قتیل کی چند خامیوں کا ذکر کرتا ہوں۔ نوجوان صدر، اور مہمان خصوصی سے معذرت کے ساتھ۔ فی الحال میں ان کی چودہ خامیوں کا ذکر کروں گا۔

قتیل کی پہلی خامی یہ ہے کہ دوست تو دوست ہر نتھو خیرے کے کام آتا ہے میرے نزدیک یہ پیشہ ورانہ رویہ ہے۔

دوسری خامی یہ کہ، نہایت ہی ہر دلعزیز اور عوامی آدمی ہے۔ جو میرے نزدیک عامیانہ رویہ ہے۔ تیسری خامی یہ کہ، اس کا دستر خوان بے حد وسیع ہے۔ جو میرے نزدیک غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے۔ پانچویں خامی یہ کہ، نہایت ہی دلیر اور اڑیل ہے۔ جو میرے نزدیک گستاخانہ رویہ ہے۔

چھٹی خامی یہ کہ، دوستوں پر جاں نثار کرتا ہے۔ جو میرے نزدیک بچگانہ رویہ ہے۔

ساتویں خامی یہ کہ، دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ جو میرے نزدیک غاصبانہ بلکہ انتقامانہ رویہ ہے۔

آٹھویں خامی یہ کہ، وہ گھڑی کی سوئیوں کی طرح منضبط زندگی گزارتا ہے۔ جو میرے نزدیک فنکارانہ رویہ نہیں ہے۔

نویں خامی یہ کہ، نہایت منہ پھٹ اور حاضر جواب ہے۔ جو میرے نزدیک شاعرانہ رویہ نہیں ہے۔ دسویں خامی یہ کہ، نہایت صاف ستھرا رہتا ہے۔ جو میرے نزدیک قلندرانہ رویہ نہیں ہے۔

گیارہویں خامی یہ کہ مہ رخوں کو پسند کرتا ہے۔ جو میرے نزدیک خالص عاشقانہ رویہ نہیں ہے۔

بارہویں خامی یہ کہ، نہایت جفاکش اور محنتی آدمی ہے۔ جو میرے نزدیک درویشانہ رویہ نہیں ہے۔

تیرہویں خامی یہ کہ، نہایت ہی بذلہ سنج اور مجلسی آدمی ہے۔ جو میرے نزدیک عارفانہ رویہ نہیں ہے۔

چودھویں خامی یہ کہ، حکومت سے قرض لے کر اپنا مکان بنالیا ہے جو میرے نزدیک راہبانہ رویہ نہیں ہے۔

تو اے سامعینِ کرام ___ اس طرح کی اور بھی ان گنت خامیاں ہیں۔ جن کا ذکر بے حد ضروری تھا۔ لیکن افسوس کہ میرے پاس قافیے ختم ہو گئے ہیں اور پھر یہ کہ قتیل کے فن پر مجھ سے زیادہ عالم فاضل لوگوں کا ابھی آپ کو سامنا کرنا ہے۔ لہٰذا میرا فرار جائز ہے۔ لیکن جانے سے پہلے میں آپ کو، شاعر کو، مہمان خصوصی اور خاص کر نوجوان صدر کو بتا تا جاؤں۔ کہ ان کے شعر اب بھی میں تعویذ کی طرح لڑکیوں پر استعمال کرتا ہوں!



نیکی کا فرشتہ

یہ اس زمانے کی بات ہے ۔ جب میں فلم میں نہیں آیا تھا ۔ اور نہ میں نے لکھنا شروع کیا تھا ۔ البتہ جب کوئی اچھا افسانہ پڑھتا یا کوئی خوبصورت گیت سنتا ۔ تو بہت جذباتی ہو جاتا ۔ طرح طرح کے خیال آتے ۔ عجیب عجیب سوچیں ۔ مصنّف کا نام تو میرے لئے مسئلہ بن جاتا ۔ میں سوچتا ۔ یہ نام تو کسی آدمی کا ہے ۔ مگر یہ تخلیق کسی آدمی کی کس طرح ہو سکتی ہے ۔ ایسی الہامی باتیں بھلا آدمی کے ذہن سے کس طرح جنم لے سکتی ہیں ۔ ؟

ایک عرصے تک یہ سوچیں مجھے ستاتی رہیں ۔ اور میں اس مافوق الفطرت ہستی کی تلاش میں سرگرداں رہا ۔ جو کلیوں کی طرح لفظ چنتا رہا ۔ اور اپنے گیتوں میں پروتا رہا ۔ میں اُسے آدمی ماننے پر تیار نہیں تھا ۔ کیونکہ اس صورت میں میرے ایک خوبصورت تصوّر کے خون ہونے کا اندیشہ تھا

لیکن — پھر ایک دن کسی نے مجھے بتایا — کہ وہ تو آدمی ہے۔ بلکہ شاعر بھی ہے۔ اور اس کا نام تنویر نقوی ہے — !

اچھا — تو وہ آدمی ہے۔ یعنی میری طرح آدمی! مجھے حیرت ہوئی۔ سخت اذیت پہنچی۔ کہ یہ شخص بڑا ادھوکے باز ہے۔ چھوٹا سا آدمی ہے اور باتیں کرتا ہے، ستاروں کی، آسمانوں کی، محبوب کی تلاش میں ایسا دیوانہ، کہ تاروں کے کارواں رواں دواں کر دیتا ہے۔ اور آواز میں اتنی سادگی اور سچائی جیسے کسی برہا کی ماری ہوئی کنواری کے زبان سے لوک گیت پھوٹ پڑا ہو!

ہاں — تو یہ تھا میرا تنویر نقوی، جس نے میرے کچے ذہن کو تسخیر کیا تھا۔ جس نے مجھے جذباتی اور رومانٹک بنا دیا تھا۔ اور مجھ پر اپنے گیتوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔ شاید زادِ راہ کے طور پر — کیونکہ ہولے ہولے یہ بوجھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور میری روح سرشار ہوتی جا رہی تھی اور یہ عقدہ کھل رہا تھا۔ کہ جیون کی پگڈنڈی پر مافوق الفطرت کا نہیں آدمی کو آدمی کا ہاتھ پکڑنا چاہیئے۔

پھر ایک دن سنا۔ کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ ہمارے بہت سے آدمی اُس پار رہ گئے تھے۔ ایک سے ایک قیمتی، ایک سے ایک پیارا، جنہیں دیکھا نہ تھا۔ لیکن اُن کی باتیں سنی تھیں۔ بڑی اچھی اچھی، پیاری

پیاری، مثلاً یہ کہ اگر کسی نے ایکٹر بننا ہو۔ فلم کی کہانی لکھنی ہو۔ یا فلم کے کسی دوسرے شعبے میں جانا ہو۔ تو بنتیک چلا جائے۔ وہاں ایک شخص تنویر نقوی رہتا ہے۔ فلموں کے گیت لکھتا ہے اس کا دروازہ شمالی ہند سے آنے والوں کیلئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہاں روٹی بھی ملتی ہے۔ بستر بھی مل جاتا ہے۔ اور یہ کہ اسٹوڈیو کے دربان سے بھی اس کی دوستی ہے۔ اس لئے اس کے دوستوں کے لئے گیٹ بھی کھل جاتے ہیں۔ اور جب تک دوست اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے۔ تنویر نقوی کے کندھوں پر بیٹھے رہتے ہیں!۔

ایسی خوبصورت ترغیب، کئی بار دل للچایا۔ بمبئی جاؤں اور اللہ میاں کے اس گائے کا دودھ پیوں۔ لیکن پاسپورٹ اور ویزے نے راستہ روک لیا تھا۔ سوچا۔ چلو بمبئی نہ سہی لاہور سہی۔

لاہور آکر وہ شخص مجھے نہ ملا۔ جو بمبئی کے حصے میں آگیا تھا۔ لیکن اپنی فطری ہٹ دھرمی کی وجہ سے میں کسی نہ کسی طرح اسٹوڈیو کے گیٹ تک جا پہنچا۔ کیونکہ میں نے ایک امریکن ایکٹر کا قول پڑھا تھا ــــ کہ میں اُن لوگوں کو ایک لاکھ ایک بار منع کروں گا۔ جو فلم میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں۔ تو پھر کامیابی اُن کے لئے مقدر ہو چکی ہے!

پھر ایک دن کا واقعہ ہے کسی نے اچانک میرے کانوں میں امرت گھول دیا۔ کہ تنویر نقوی پاکستان آگیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور تنویر کے کندھوں پر بیٹھنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن یہ حسرت تو ابھی تک مکمل طور پر زندہ تھی۔ کہ میں اس شخص کو دیکھوں جس نے میرے کچے ذہن کو تسخیر کیا تھا۔ اب میں اُسے بزعم خود بالغ ذہن سے دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن کا ذکر ہے۔ میں راٹل پارک میں کھڑا تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ۔ ایک شخص ہمارے قریب سے گزرا اور سلام کر کے آگے نکل گیا۔ کسی نے سرگوشی کی۔ یہ تنویر نقوی ہے!

میں دنگ رہ گیا میرے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ چالیس بیالیس سال کا گول مٹول سا ایک خوبصورت بالغ بچہ — اگر اس کے ہاتھ میں چرمی بیگ کے بجائے بنسری ہوتی۔ تو میں بے تحاشہ چیخ اٹھتا کہ دیکھو لوگو۔ کرشن کنہیّا جا رہا ہے —!

لیکن میں چپ ہو گیا تھا۔ سفید کرتے اور سفید تنگ پاجامے میں ملبوس یہ بالغ بچہ مجھے بے حد پیارا لگا۔ اور اُس سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کی خواہش دو چند ہو گئی۔

شاید میری لگن سچی تھی۔ جلد ہی اُس کے اسباب بھی پیدا ہو گئے

مجھے ایک فلم کی ڈائرکشن مل گئی تھی۔ میں نے فلمساز سے کہا۔ گانے تنویر نقوی لکھے گا۔"

فلمساز نے معذرت کی ۔ "وہ تو بہت نام والا آدمی ہے۔ پیسے زیادہ لے گا۔ اور ہمارا بجٹ محدود ہے۔" میں نے فلم ساز سے کہا۔ "آپ جتنے پیسے کسی دوسرے شاعر کو دیں گے۔ اُتنے پیسے تنویر کو دیں۔ اور جو زائد پیسے تنویر کے بنیں گے۔ وہ میرے حساب سے دیدیں۔"!

فلمساز سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن یہ خبر کسی تیسرے ذریعے سے تنویر تک پہنچ گئی۔ وہ میرے غائبانہ پرستش اور محبت سے اس قدر متأثر ہُوا۔ کہ اُس نے کم معاوضے پر اس فلم کے گیت لکھنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ فلمساز کو میرے فیصلے کا تو علم تھا ہی۔ لیکن جب میری طرح ایک اور دیوانے کے فیصلے سے آگاہ ہُوا۔ تو اس کی فرزانگی کو بھی شرم آگئی۔ اور تنویر کو پورا معاوضہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔

یہ تھا میرا اور تنویر کا پہلا تعارف۔ کہ ملے بغیر ایک دوسرے کے دلوں میں جا بیٹھے۔

پھر وہ دن بھی آگیا کہ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت دہانہ، ہنستی ہوئی کاجل بھری آنکھیں۔ نہ شاعرانہ تمکنت اور نہ شہرت کی رعونت۔ نہ بلند بانگ دعوے اور نہ دل دکھانے

والی بلند آہنگی۔ سیدھا، سچّا اور کھرا آدمی۔ تحمّل سے دوسروں کی بات سننے والا۔

میں نے کہانی کا خاکہ سنایا۔ تو بہت خوش ہوا۔ خوشی اس بات کی، کہ کہانی ہٹ کر ہے۔ اور گانوں کی سیچوایشن نئی ہیں۔

چار گھنٹے ہم اکھٹے رہے۔ چار گھنٹوں کی اس پہلی نشست میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا۔ کہ اس نے کوئی احساس پیدا کیا ہو کہ میں تم سے زیادہ تجربہ کار، نامور یا عظیم ہوں۔

جب وہ چلا گیا تو میرا فلمساز کہنے لگا۔ "یار یہ تو بڑا بھگت آدمی ہے، بالکل حضرت عیسےٰ کی بھیڑ ۔۔۔!"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "خیال رکھنا۔ اس کے گلے پر چھری نہ پھر جائے۔"

اس طرح دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ آدمی، جسے ہم نے انمول گھڑی کے واسطے سے پہچانا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے طور سے جانا۔ اور ہماری روحیں سرشار ہو گئیں۔

فلمی گانوں کے متعلق اس کا رویہ اتنا نرم اور لچکیلا ہوتا۔ کہ حیرت ہوتی تھی۔ نہ وہ خود اہمیتی کے احساس میں مبتلا تھا۔ اور نہ اپنی رائے تھوپتا تھا۔ تنویر جیسے شاعر کو یہ کہنا کہ آپ سیچوایشن کو گرفت

یں نہیں لے سکے۔ بہت مشکل کام تھا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ کہ وہ سیچوایشن کی ضرورتوں کو نظر انداز کر دے۔ یا سہل پسندی سے کام لے۔ لیکن اگر کبھی کبھار ایسا ہوا۔ تو وہ نہایت بردباری سے ڈائرکٹر کی بات سنتے۔ قائل ہونے کے انداز میں ہنستے۔ اور دوبارہ سہ بارہ بلکہ کئی کئی بار اس پر طبع آزمائی کرتے۔ نہ گھبراتے۔ نہ عذر پیش کرتے نہ دلیل ڈھونڈتے۔ اور نہ قائل کرنے والا رویّہ اختیار کرتے۔ بس وہی دھیمی سی ملائم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیلتی رہتی۔ حتیٰ کہ کسی صبح اپنے براق کرتے کی طرح اُجلا اُجلا گیت ڈائرکٹر کے ہاتھوں میں تھما دیتا۔ یہی وہ لمحہ ہوتا تھا۔ جب ڈائرکٹر میوزک ڈائرکٹر، فلمساز اور خود شاہ جی کی آنکھوں میں پریاں ناچتی نظر آتی تھیں۔ تب شام کے پروگرام بنتے اور زندگی چند گھڑیوں کے لئے ذمہ داریوں کے بوجھ کو الوداع کہہ دیتی۔

تنویر وہ شاعر نہیں تھا۔ جو علم کے زور سے مصنوعی شعر کہتا ہے۔ بلکہ وہ فطرتاً شاعر تھا۔ اس کا وجدان، اس کا مزاج، اس کا ضمیر اس مٹی سے عبارت تھا۔ جو صرف فطری فنکاروں کے لئے مقسوم ہوتا ہے۔ وہ دماغ سے نہیں دل سے شعر کہتا تھا۔

وہ سرتاپا شاعر تھا۔ انتقام نہ لینے والا۔ بغض اور حسد نہ رکھنے والا، درگذر

کر دینے والا۔ معاف کر دینے والا، وہ عجیب و غریب کردار تھا۔ وہ اس صدی کا آدمی ہی نہیں تھا۔

اس نفسا نفسی کی صدی میں، جہاں کسی کو دوست کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تنویر کو اپنی آنکھوں میں بسانے کو جی چاہتا تھا۔

اس بھولے بھالے آدمی سے اس زمین کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی کے برائی میں نہیں تھا۔ وہ نیکی کی استقامت نور کھتا تھا۔ اور اس استقامت سے کام بھی لیتا تھا۔ لیکن اتنا بزدل تھا۔ کہ بدی کسی سے نہ کر سکا۔ دراصل اس میں بدی کرنے کی اہلیت ہی نہیں تھی۔ بلکہ یہ اہلیت اُسے فطرت نے ودیعت ہی نہیں کی تھی ۔۔۔ جس طرح بعض لوگ منہ میں سونے کا چمچ لیکر پیدا ہوتے ہیں۔

تنویر نے خیر کی گھٹی پی کر جنم لیا تھا۔

وہ نیکی اور امن کی علامت تھا۔

لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ لوگ پیغمبروں سے شاکی رہتے ہیں۔ خدا پر تنقید کرتے ہیں۔ ایک وقت آیا جب تنویر پر فالج کا حملہ ہوا۔ کام چھوٹ گیا۔ اور دوست اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ دسترخوان کے ساتھی، بوتل کے ساتھی، سب تاریک گوشوں میں گم ہو گئے اور کمین گاہوں سے تیر پھینکنے لگے ۔۔۔ کہ چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کچھ بچایا ہوتا۔ تو آج کام آتا۔

ظالمو — سب کچھ چاٹ کر اب الزام بھی لگاتے ہو۔ کہ سورج سے حرارت کیوں خارج ہوتی ہے اور اس کی شعاعوں میں چاندنی کی طرح ٹھنڈک کیوں نہیں ہوتی —؟

ٹھیک ہے۔ ایک طرح سے یہ لوگ۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ بدی نہ ہوتی تو نیکی کی اہمیت کہاں باقی رہتی۔ بدصورتی نہ ہوتی۔ تو تنویر کی طرح خوبصورت لوگوں کی طرف نگاہ کیوں کر اٹھتی۔

میں سمجھتا ہوں — یہ پہلا موقع تو نہیں ہے۔ کہ فنکار کے لاابالی پن سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہو۔ موت سے پہلے میراجی کا جو حشر ہوا وہ کم تھا کیا؟ منٹو کو آخری دنوں میں جتنا حقیر جانا گیا۔ وہ توکل کا واقعہ ہے۔ جو لوگ پانچ روپے دینے کے روادار نہ تھے۔ انھیں لوگوں نے پانچ پانچ سیر کے ضخیم نمبر نکال کر اس کی موت پر مگرمچھ کے آنسو بہائے — ٹھیک ہے۔ ایسے لوگوں نے پیسے بنائے، جائدادیں خریدیں۔ اور اپنی اپاہج اولاد کے لئے کوٹھیاں بھی چھوڑ جائیں گے۔ لیکن وہ میراجی کبھی نہ کہلا سکیں گے۔ وہ منٹو کبھی نہ بن سکیں گے اور تنویر بننے کی حسرتیں انہیں قبر میں چین سے سونے نہیں دیں گی۔



شاعرِ بے ریا

مرنجان مرنج، یاروں کا یار، چھوٹا سا قد، منحنی سا جسم۔
سرحد کی بے حد اہم، قدآور ادبی شخصیت ہے۔
اس کا نام فارغ بخاری ہے۔

میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب میں نے لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ مختلف رسائل میں اس کا کلام، اس کی تصاویر دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔ کہ اس کے کلام میں سرحد کی مٹی کی خوشبو ہوتی تھی۔

پھر اس شخص کا میں اور زیادہ گردیدہ ہو گیا۔ جب "اٹک کے اس پار" کا ہمالہ جیسا لحیم شحیم نمبر دیکھا۔ پشاور، جو لاہور، لکھنؤ اور دہلی کے مقابلہ میں ادبی لحاظ سے محض صفر تھا — اتنا ضخیم اور پرمغز نمبر نکال کر فارغ نے پورے ملک کو چونکا دیا تھا۔

نہ وسائل نہ سرمایہ، مگر اس جن نے وہ کر دکھایا۔ جو ناممکن تھا۔ ہندکو بولنے والا، اردو لکھنے والا، پشاور کے اس ادیب نے سرحد میں نہ صرف اردو کا چراغ روشن رکھا۔ بلکہ پشتو کے کلاسیکی ادب کو بھی اردو دان طبقہ سے روشناس کرایا۔ یہ کام کوئی ایسا ادیب نہیں کر سکتا تھا جو محض علاقائی زبان تک محدود ہوتا۔ یہ کام فارغ جیسے مستند ادیب کو سجتا تھا۔ جو پشتو، ہندکو، اردو کے علاوہ فارسی پر بھی عبور رکھتا تھا — اور اس نے یہ کر دکھایا۔

مجھے فارغ سے ملنے کا بیحد اشتیاق تھا۔ یہ اشتیاق اس زمانے سے تھا۔ جب میں فارغ کا ایک گمنام قاری تھا — کیونکہ جب بھی سرحد کے ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ لے دے کے فارغ ہی کا نام سرفہرست ہونا شروع شروع میں، میں فارغ رضا کو ایک ہی آدمی سمجھتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا۔ کہ دو الگ الگ آدمی ہیں، مگر یک جان دو قالب ہیں۔

کئی برس ادھر کی بات ہے۔ میں ایک آپریشن کے ذریعے اپنی چھ پسلیاں گنوا بیٹھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر کوہاٹ آ گیا۔ اتفاق سے کوہاٹ میں مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ اس مشاعرے میں فارغ نے بھی پڑھنا تھا۔ بوجہ کمزوری مشاعرے میں تو شرکت نہ کر سکا، مگر فارغ سے ملنے کے لئے جناب عزیز اختر وارثی کے گھر تک چلا گیا۔ جہاں وہ دوسرے

شعراء کے ساتھ کھانے پہ مدعو تھا۔

تعارف کی دیر تھی۔ فارغ مجھ سے بے ساختہ لپٹ گیا۔

میں حیران و ششدر، کہ ایسے بے پناہ خلوص کی توقع ہی کب تھی۔؟

اور اُدھر محبت کا ایسا شدید اظہار، گویا جنم جنم سے شناسائی ہے۔!

فارغ کی اس سادگی اور کھرے پن سے میرا سینہ بھر بھر گیا۔ میں نے روح میں گدگدی، اور اپنے بیمار و ناتواں جسم میں توانائی سی محسوس کی۔

لاہور سے کب آیا۔ کیوں آیا، بیماری کیسے آئی۔ پسلیاں کیوں کٹ گئیں ـــ؟ اس نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے ـــ دراصل یہ سوال نہیں تھے۔ محبت کا وہ ردعمل تھا جس نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

اس نے چشم زدن میں مجھے فتح کر لیا تھا۔

تب میں نے سوچا، کہ امیر آدمی بننے کے لئے شاید منصوبہ بندی کی ضرورت ہو، لیکن بڑا آدمی بننے کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی ـــ بڑا تو پیدا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس کا خمیر ہی مختلف ہوتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں کوئی چیز ایسی مخفی ہوتی ہے، کہ بے اختیار دل اس کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔

فارغ کا یہ پہلا تاثر میرے ذہن میں ایسا نقش ہو گیا، کہ پندرہ سال بعد بھی روزِ اول کی طرح آج بھی تازہ و شگفتہ ہے ـــ وہ

لوگ جو زندگی میں حسن ڈھونڈتے ہیں محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ اور روئے زمین کے سارے انسانوں کو سکھ سے دو چار کرنے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ نظروں سے کس طرح اوجھل رہ سکتے ہیں۔

فارغ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔

جس طرح محترم آغا بابر نے پہلے افسانے پر مبالغے کی حد تک مجھے تعریف سے نوازا تھا۔ اور میرے لئے اردو ادب کے دروازے کھول دیئے تھے۔ اسی طرح فارغ نے میرے پہلے ناول کا مسودہ پڑھنے کے بعد میری جس انداز میں حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہ اسی کا فیضان ہے۔ کہ میں فلم سے ناول کی طرف آیا۔ اور اب فکشن کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

ایک صفت جو میں نے ندیم صاحب میں دیکھی۔ فارغ میں بھی موجود ہے کہ وہ بخیل آدمی نہیں ہے۔ فن و ادب میں وہ کبھی بُخل سے کام نہیں لیتا اس کی جھولی میں جو کچھ ہوتا ہے۔ سائل کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ یہ بہت دل گردے کی بات ہے۔

لوگ شعر لوا گل دیتے ہیں مگر سچ اگلنے سے دامن بچاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ جو سچ نہیں اگل سکتا۔ وہ شعر کیسے اگل سکتا ہے۔ اور اگر اگلتا ہے تو وہ مصنوعی شعر ہوتا ہے۔ سچا شعر وہی کہہ سکتا ہے۔ جو سچا آدمی ہو۔

سچے ظرف کا آدمی ۔ !

فارغ سچے ظرف کا آدمی ہے ۔ !!

کراچی یا لاہور سے کوئی بھی ادیب پشاور جاتا ہے ۔ اور اُسے شعراء اور ادباء سے ملنا مقصود ہوتا ہے ۔ تو اس کے لئے لازم ہوگا ۔ بلکہ وہ مجبور ہوگا ۔ کہ سب سے پہلے فارغ کو تلاش کرے ۔ فارغ کو تلاش کرنا قطعی مشکل نہیں ہے ۔ کیونکہ جب بھی کوئی غیر سرحدی ادیب اٹک پار کرتا ہے ۔ فارغ اس کی خوشبو پالیتا ہے ۔ اور مہمان بھٹکنے سے بچ جاتا ہے ۔

فارغ نے زندگی بنانے کیلئے بہت پاپڑ بیلے ہیں ۔ ہر ادیب اور شاعر کی طرح وہ ہمیشہ مالی پریشانیوں سے دوچار رہا ۔ مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پہ نہ لایا ۔ رزق کے خوف نے اُسے کبھی سرنگوں ہونے نہ دیا ۔

ایک واقعہ میرے علم میں ہے ۔ فارغ اپنے سیاسی نظریات کی وجہ سے اکثر زیرِ عتاب رہا ہے ۔ وہ کئی بار گرفتار ہوا ۔ کئی بار جیل گیا ۔ معاشی بدحالی کا یہ عالم ، کہ گھر میں فاقے ہیں ۔ مگر خودداری کی یہ شان ، کہ لاہور کے ایک دوست نے پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیجا ۔ تو ان کی بیگم نے شکریے کے ساتھ روپیہ واپس کر دیا ۔

اب ایسا آدمی جو دوستوں کی احسان مندی کو بھی اپنی انا کے

منافی سمجھتا ہو۔ حکومت کے سامنے کیونکہ جھک سکتا ہے۔ یا کوئی اور طاقت اسے کیسے خرید سکتی ہے ۔۔۔ ؟

حسینی روایت بھی کبھی مر سکتی ہے ۔۔۔!؟

فارغ کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ بہت جلد روٹھ جاتا ہے۔ بعض دوست اسے بالغ بچہ کہتے ہیں۔ میں اسے دانشور بچہ کہتا ہوں۔

کیونکہ ان کا روٹھ جانا ایسا معصومانہ فعل ہوتا ہے۔ جیسے گلاب کی کلی اچانک چٹختی ہے۔ اور چاروں سمت خوشبوئیں بکھیر دیتی ہے۔ کیونکہ فارغ اگر صبح روٹھتا ہے۔ تو شام کو یقیناً گلے لگے گا۔ اور ناراض کرنے والے کو چومے گا جس آدمی کے سینے میں نفرت کا خانہ ہی نہ ہو۔ وہ بھلا شام تک گھر نہیں لوٹے گا۔ تو اور کہاں جائے گا ۔۔۔!

اس زمین پہ ایسے لوگ بھلا کہاں ہوں گے۔ اور اس صدی میں تو کم کم ہی ہوں گے ۔۔۔

فارغ نے نوجوانی میں لکھنا شروع کیا۔ اور اب تک لکھے جا رہا ہے یعنی ساٹھا باٹھا ہو گیا ہے۔ مگر قلم میں وہی روانی ہے ۔۔۔ جیسے اس کا دل جوان ہے۔ ویسے ہی اس کا قلم جوان ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ عمر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ نہ اس کے سیاہ بال سفید ہو سکے۔ اور نہ قلم کی جولانی رک سکی۔

یہی نہیں۔ فارغ کا اپنا ایک معیار ہے۔ اور وہ اسے قائم رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یوں کہنا چاہیئے۔ کہ چالیس سال پیشتر کا فارغ بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کی سوچوں کو گرفت میں لئے رواں دواں نظر آتا ہے۔

بیشک وہ جواں سال نہیں رہا مگر جواں فکری قائم ودائم ہے وہ روایتی شاعر نہیں۔ سائنسی افکار اور نئے رویّے اُسے کنفیوژن کی طرف نہیں لے جا سکے۔ وہ اپنے مشاہدے اور مطالعے کے زور سے نہ صرف تازہ دم ہے۔ بلکہ قافلہ سالار ہے۔ کیونکہ وہ فطری شاعر ہے۔ یہ فطری شاعر جب دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہو۔ تو بے ساختہ قہقہے لگاتا ہے۔ نہایت تیکھے وار کرتا ہے۔ اور اپنی فطری ذہانت کی نئی نئی پھلجڑیاں چھوڑتا ہے۔ یہ ہنستا کھیلتا دانشور بچہ جب لکھنے کا موڈ بناتا ہے۔ تو باقاعدہ غسل کرتا ہے۔ اپنے سیاہ بالوں کو تیل لگاتا ہے۔ اور نہایت سلیقے سے بٹھاتا ہے۔ دھلی ہوئی استری شدہ پینٹ پہنتا ہے۔ بے داغ قمیص بااہتمام سے ٹائی لگاتا ہے۔ اور بے حد سبک احساس کے ساتھ میز کرسی پہ بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہے۔

اس معاملے میں وہ بالکل انگریز ہے۔ جو سوٹ اور ٹائی کے بغیر لنچ اور ڈنر کا تصور نہیں رکھتا۔

فارغ پورے تقدس کے ساتھ لکھنے کے لئے بیٹھتا ہے۔ اور عبادت کی طرح اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہے ۔۔ وہ چالیس سال سے عبادت میں غرق ہے۔۔ قضا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ !

میری دعا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے دعا ہے۔ کہ جب تک وہ زندہ رہے۔ (بہت دیر تک ہی زندہ رہے) اس کی عبادت کا ہر ہر لمحہ زندہ و تابندہ رہے۔۔ حتیٰ کہ عزرائیل آئے۔ تو سوچوں میں پڑ جائے۔ کہ موت برحق ہے۔ مگر شاعر کے انہماک کو توڑنے کا پروانہ تو اس کے پاس نہیں ہے !



حبیب جالب کے نام

میں نے سنا ہے۔ اس ملک میں دو جالب ہیں
ایک کا نام حبیب جالب، دوسرے کا نام افتخار جالب ہے،
میں نے دیکھا ہے جس آدمی کا نام جالب ہوتا ہے وہ غالب نہیں ہوتا
مگر جالب ضرور ہوتا ہے ـــ یار لوگ پوچھیں گے ـــ اس کے کیا معنی۔ ؟"

تو میں کہوں گا ـــ جالب کے معنی وہ نہیں ہیں جو غالب کے ہیں
مگر پھر بھی جالب بامعنی لفظ ہے ـــ لغوی معنی تو لغت والے
جانیں مگر جو میں جانتا ہوں وہ یہ کہ جس کا نام جالب ہوگا وہ غالب نہیں
ہوگا مگر غالب کی طرح دوسروں سے مختلف ضرور ہوگا۔

بفرض محال اگر وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا پسند نہیں کریگا تو ایک
آدھ مکتب کھولنے کا ارادہ ضرور کریگا۔ چاہے یہ مکتب، مکتبِ خیال ہی

کیوں نہ ہو — !
افتخار جالب کو دیکھ لیجئے کوئی مانے نہ مانے، ایک سکّہ بند مکتبہ کے گرو ہیں اگر کسی گرو کے ساتھ دس چیلے بھی ہوں تو ہم اُسے رَد نہیں کر سکتے۔
ہم تو اقبال ساجد کو بھی رَد نہیں کر سکتے جو خود ہی گرو اور خود ہی چیلا ہیں — افتخار جالب کے پشت پر تو خیر سے پورا مکتبہ ہے اور پوری ادبی دنیا اُسے ایک خاص احترام دیتی ہے اور اس کی انفرادیت کی قائل بھی ہے۔
اب دوسرے جالب کو لیجئے یعنی حبیب جالب، یعنی تم — !
یہاں کیسے کیسے جغادری ادیب اور شاعر ہیں مگر کسی نہ کسی گوشۂ عافیت میں منقار زیرپر ہیں۔ بھلا بھی اسی میں ہے کہ سوسوچ جس سمت سے طلوع ہو دروازہ بھی اسی جانب رکھا جائے روشنی نہ ہوگی۔ تو تخلیق کیسے ہوگی —
مگر کچھ بدقسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو مرغِ بادنما کی فطرت نہیں رکھتے اور اس تکنیکی صدی میں بھی احساس کے راج پاٹ کا خواب دیکھتے ہیں۔

حبیب جالب —! ایسے بدبختوں میں تمہارا نام سرِفہرست ہے۔
کوئی پوچھے تم سے، مکتبہ ہی کھولنا تھا تو ایک ہزار مضامین تھے — فریب کی بات کرتے کہ مارکیٹ میں بھاؤ لگتا، جھوٹ جیسے چالو مال کی طرف

بھی دھیان نہ گیا، اس کے علاوہ پان اِزم ہے نان ازم ہے، سلام ازم غلام ازم اور دشنام ازم، کتنے ازم ہیں، کتنے مکتبۂ خیال، کیا ضرور تھا کہ مکتبۂ سچ ہی کھولتے۔

بیسویں صدی اور مکتبۂ سچ ——!

واہ جالب ——، جالب اصولوں کے لئے جینا ہے!!

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔!!!

جس سچ کیلئے تم جیلوں میں جاتے ہو اس کا پس منظر بس اتنا ہے نا، کہ تمہارا ایک چھوٹا سا گھر ہو اس میں فلیش ہو اور شاور بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔

تو اے سادہ دل اور صاحب دل شاعر! اور بندۂ خدا، اگر سچ ہی بولنا ہے تو پھر خدا کے گھر ہی پہ اکتفا کرلو جیل یاترا کا شوق کیا ضروری ہے۔ جیل میں تو چور جاتے ہیں ڈاکو جاتے ہیں اور یا پھر لیڈر ——!

اور ظاہر ہے تم چور ہو اور نہ ڈاکو، اور لیڈر ہونے میں بھی اس لئے شک ہے کہ حویلی رکھتے ہو نہ اصطبل، تمہارا تو اپنا گھر بھی نہیں ہے —— تو پھر — ؟'

ایک بات اور سنو —— معلوم ہوا ہے دو چار دنوں میں تم

پچاس برس کے ہو جاؤ گے اور تمہاری عقل داڑھ نکل آئے گی ــــــ

لگ بھگ یہی عمر میری بھی ہو رہی ہے مگر ابھی تک جیل سے محفوظ ہوں اس کا مطلب ہے میری عقل داڑھ تم سے پہلے نکل آئی ہے اس کا ثبوت یہ ہے تمہیں یاد ہو گا تم نے میرے کسی فلم کا گانا لکھا تھا پانچ سو معاوضہ طے ہوُا تھا مگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا اور اس لمحے کا منتظر تھا جب تمہیں پیسوں کی شدید ضرورت ہو گی اور تم سو لیکر پانچ سو کے ووچر پہ دستخط کر دو گے۔

اور تم ایسے جی دار کہ بالآخر اپنی روایتی عالی ظرفی سے تم نے یہ موقع بہم پہنچایا' اور سو روپے کا کڑکڑاتے دار نوٹ لے کر پانچ سو روپے کے ووچر پہ دستخط کر دیئے ــ

تمہارے یہ تاریخی دستخط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں مانوں نہ مانوں لوگ تو تمہیں لیڈر مانتے ہیں۔ اور لیڈروں کے آٹو گراف تو اُن کے فین حاصل کرتے ہی ہیں۔

چلو تھوڑی دیر کے لئے مان لیا کہ تم لیڈر ہو مگر ایسے لیڈر کہ بارقسمتی سے اصولوں کی جنگ لڑتے ہو اس طرح کے سچے لیڈر اول تو ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتے' پیدا ہوتے ہیں تو کھوٹے سکے کی طرح چلتے نہیں ــــ

سو برادرم ــــــ، میری مانو، زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد! والی سیاست چھوڑ دو، لچک پیدا کرو۔ طوفان آتے تو گھاس کی طرح لیٹ جاؤ، طوفان گزر جائے تو پھر سے سر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔

یوں زیادہ زندگی پکڑو گے!

اور اگر اکڑ کے اکڑ ہی رہے اور اصولوں کے راگ الاپتے رہے تو پھر مجھے تمہاری اور اپنی دوستی پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی ــــ ایسے لیڈر سے دوستی کا کیا فائدہ، کہ اُفتاد پڑے تو اصولوں کی مالا جپتا رہے اور دوست کی دستگیری پر یوں توجہ نہ دے کہ اس کے خود ساختہ اصولوں کی نفی ہوتی ہے۔

سن حبیب جالب، تم جب بھی جیل گئے ہو ہم نے ہمیشہ افسوس کا اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے ــــــ ٹی ہاؤس کے بہت سے دوست گواہ ہیں، تمہارے بچوں سے اپنے بچوں کی طرح محبت اور ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں اور ان کی مالی امداد ہمارے فرائض میں شامل تھی اور اس فرض کی تکمیل دل و جان سے کرنا بھی چاہتے تھے مگر بُرا ہو اس ملک کی سی آئی ڈی کا ــــ

ایسا خوف دامن گیر کہ ہزار خواہشوں کے باوجود تمہاری گلی کا پھیرا نہ ہوا اور دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے ــــ

مگر ایک بات تباؤں جالب، میرے اور آپ کے بہت سے دوست حیران ہیں کہ یہ جالب ہے تو شاعر، مگر ایسا اصول پسند کیونکر بن گیا ۔۔۔ ویسے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ جہاں تمہارے سچ نے تمہیں ایک اچھا شوہر اور اچھا باپ نہ بننے دیا وہاں اندرونِ خانہ لوگ تجھے ماننے بھی لگ گئے ہیں یہ اور بات ہے کہ اس ماننے میں خوف زدگی کا عنصر بھی شامل ہے ۔۔۔ اس خوف زدگی کی بھی دو شکلیں ہیں، پہلے یہ کہ، جی دار آدمی ہو اور کولہو کے بیل کی طرح سچ کے کولہو میں جُتے ہوئے ہو۔ جو بجد مشکل اور کم از کم شاعروں ادیبوں کے لئے ناممکن بھی ہے کہ ایسے استقلال کا مظاہرہ کریں ۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بدقسمتی سے تمہارا ایک امیج بن گیا ہے ۔۔۔ یعنی جو شخص مسلسل تیس برس سے کسی بھی حکومت سے نہیں ڈر رہا۔ اور ہر طرے خان سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتا رہا ہے ظاہر ہے ایسے چٹان کو سلام کرنے میں کیا حرج ہے ۔۔۔ !

"تو برادرم جالب ۔۔۔ یوں ہم تجھے سلام کرتے ہیں مگر یہ نفسیاتی سلام ہے ہم موقع کی تلاش میں ہیں کہ تمہاری کوئی کمزوری ہاتھ آئے اور پھر جی بھر کر تمہاری تضحیک کا سامان کریں، نہ کر سکیں تو کوئی اور شوشہ چھوڑیں کہ تم سرمایہ داروں کے پٹھو ہو، سرخ ریچھ کے ایجنٹ

ہو یا انکل سام کے پروردہ ہو ۔

مگر تم ایسے ظالم، ایسے ستم ظریف، کہ موقع ہی نہیں دیتے اپنے رویے سے ان سب باتوں کو جھٹلا دیتے ہو نہ جیب میں سگریٹ کے لئے پیسے نہ ڈھنگ کے کپڑے، چائے تک کسی کو نہیں پلاتے وہی جالب کے جالب، بکڑائی نہیں دیتے ۔ !

کسی سچے آدمی کو ایسی سنگدلی کچھ زیب نہیں دیتی کہ دوست احباب تڑپیں اور تم فاقہ مستی میں بھی اُن کے ہاتھ نہ آؤ ۔ !

دیکھو دوست ۔، اپنے رویے پر نظر ثانی کرو میرے صائب مشورے تمہیں اس لئے بھی قابل قبول ہونے چاہئیں کہ ایک تو تمہارا کلیگ ہوں تم شاعر ہو میں ادیب ہوں دونوں تقریباً ہم عمر بھی ہیں۔ تمہاری شاعری اور میرے ادب کی عمر بھی تقریباً ایک جتنی ہے دونوں کا تعلق کسی نہ کسی پہلو فلم سے بھی رہا ہے۔

تو جالب بھائی، ان اقدار مشترک کی بنیاد پر حق بنتا ہے کہ دوستی کا دعویٰ کروں اور دوستی کی آڑ میں تمہیں راہ راست کا سگنل دوں۔ تجھے بتاؤں، تجھے سمجھاؤں کہ بھلے آدمی، کہ تم جو نہ شہزادے ہو، نہ صاحبزادے اور نہ انولزادے، بھلے آدمی تم تو رئیس زادے بھی نہیں ہو ۔ !

پھر کس برتے پر سیاست کرتے ہو ۔۔۔ ؟

ایوانِ اقتدار تم جیسے آوارہ منش شاعروں کے لئے نہیں ہوتے۔ چھری اور چمچے کی تہذیب سے تم ناآشنا، انگریزی سکولوں میں تم نے نہیں پڑھا، تم تو ٹھیک سے انگریزی کے لہجے نہیں جانتے کیمرج اور آکسفورڈ کا لہجہ کہاں سے لاؤ گے ۔۔۔ ! ؟ آکسن لہجہ نہیں رکھتے تو فارن ڈیلیگیٹ سے ڈیل کس طرح کرو گے خارجہ معاملات کے لئے سوجھ بوجھ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی آکسن لہجے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بھائی میکر ۔۔۔، تمہارا تو اردو لہجہ ٹھیک نہیں ہے خود مجھے دیکھو اردو زبان کی پانچ چھ کتابوں کا مصنّف ہوں مگر اردو پشتو لہجے میں بولتا ہوں ۔۔۔ تم بلاشبہ فطری شاعر ہو، صاحب کتاب ہو بلکہ صاحب کتب ہو مگر اردو بولتے ہو تو فوراً پکڑے جاتے ہو کہ پنجابی ہے ۔۔۔ ! تو بھائی صاحب، ایک تو آکسن لہجے کی کمی، اور اس پہ دھر پنجابی، اور اس پہ ایوان اقتدار کے خواب ۔۔۔ ! ؟

تم نے سنا نہیں پنجاب میں سیاستدان نہیں ہوتے پنجاب میں صرف "ڈگے" ہوتے ہیں۔ جو عموماً ایران اور افغانستان سمگل ہو جاتے ہیں ۔۔۔ !

معلوم ہوتا ہے کہ تم تاریخ کے طالب علم نہیں ہو۔

ظاہر ہے نہیں ہو، ورنہ کبھی سیح نہ بنتے کبھی اصولوں کا پرچار نہ کرتے اور نہ کبھی جیل کی ہوا کھاتے، میں ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ تم تاریخ کے طالب علم نہیں ہو، تم نے نہ چانکیہ کو پڑھا ہے نہ میکاولی کو، اور چلے سیاست کرنے ـــــ

نا بابا نا ـــــ تم کبھی وزیر نہیں بنو گے تمہارے طبقے کے لوگوں کو وزارت راس نہیں آتی، کبھی بھول چوک سے "قلمدانِ وزارت مل بھی گیا تو جو حال "رامے" کا ہوا، تمہارا بھی ہو گا،

پھر نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے ـــــ!

تم عوامی شاعر ضرور ہو مگر ایک عامی کے ذہن اور ذہنیت سے ناواقف ہو ـــــ تم وزیر بن جاؤ گے تو یہی کر سکو گے نا، لاکھ دو لاکھ کا ہیر پھیر، کہ یہی تمہاری اوقات ہے مگر تم اپنے عالی ظرف عوام کو نہیں جانتے۔

اتنی حقیر بے ایمانی پہ وہ تمہارا مذاق نہیں اڑائیں گے تو اور کیا کریں گے،

یعنی کتنا ٹٹ پونجیا وزیر، لاکھ دو لاکھ پہ اکتفا کرنے والا!

تمہاری عوام تمہاری عظمت اس وقت تسلیم کرتی جب تم دو چار

ادب کا غبن کرتے اور اخبارات شہ سرخی لگاتے۔

ایشیا کا عظیم ترین فراڈ ۔۔۔!

تب تمہارا صحیح امیج بنتا اور صحیح مقام، کیونکہ قبل ازیں ہم لوگ "ایشیا کی عظیم مِل" "ایشیا کا سب سے عظیم بند" "ایشیا کا عظیم کھلاڑی" اور "ایشیا کا خوبصورت وزیر اعظم" جیسے نعروں کے عادی ہو چکے ہیں۔

"ایشیا کے عظیم فراڈ" سے تم تاریخ کا سنہری باب بن جاتے امر ہو جاتے، پھر تمہیں نہ شاعری کی اُمنگ ہوتی نہ سچائی اور اصولوں کی ضرورت، اور نہ شہرت کی خاطر لاکھوں کے مجمع کی تلاش۔!

تو بھائی ۔۔۔ ارض کی ساری حقیقتیں میں نے تم پر واضح کردی ہیں آگے تم خود ہوشیار ہو۔ آدھی صدی سے زمین پر دندناتے ہو اب تو عقل داڑھ بھی نکل آئی ہو گی ۔۔۔

بھاڑ میں جائے ایسی دیوانگی اور فرزانگی۔

آؤ میں تجھے پتے کی بات بتاؤں ۔۔۔ میرا ایک ہمسایہ ہے اسے لوگ بھیا کہتے ہیں بھیا پان بیچتا ہے یہ پتے کی بات جو میں تجھے بتا رہا ہوں مجھے بھیا نے سمجھائی تھی ۔۔۔

کہ گھر بنانا ہے تو پان کا کھوکھا بناؤ کھوکھا بن جائے گا تو گھر بھی بن جائے گا ۔۔۔!؟



سچّا اور سُچّا قہقہہ

بیس بائیس برس ادھر کی بات ہے۔ میں اُن دنوں ہوٹل بیت القیام میکلوڈ روڈ میں رہائش پذیر تھا۔ ایک دن کیپٹل فلم کے روحِ رواں شیخ لطیف مرحوم میرے کمرے میں آئے۔ وہ ابراہیم جلیس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

دراصل انہوں نے جلیس کی کوئی کتاب تازہ تازہ پڑھی تھی۔ وہ جلیس کی تحریر سے بے حد متاثر اور مرعوب تھے اور ان سے اپنی نئی فلم لکھوانا چاہتے تھے۔ میں نے شیخ مرحوم سے کہا۔

یہ شخص جس کا نام جلیس ہے۔ میں بھی اس سے ملنے کا خواہش مند ہوں میں نے بھی اس کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور آپ ہی کی طرح اس سے متاثر بھی ہوں۔ مگر ذاتی طور پر اُسے نہیں جانتا۔ کراچی میں رہتا ہے اگر آپ مدیر نگار الیاس رشیدی سے رابطہ پیدا کریں۔ تو جلیس سے

بات ہو سکے گی۔"

چند دن بعد معلوم ہُوا۔ کہ ابراہیم جلیس لاہور آگیا ہے۔ اور اس نے کہانی پر کام شروع کر دیا ہے۔ منیر نیازی ملا۔ ان دنوں ہم تقریباً روزانہ ملتے تھے۔ میں نے جلیس کا ذکر کیا تو بولا۔

"ہاں آگیا ہے۔ کسی دن چلو اس کی گپ شپ سننے۔!"

میں نے کہا۔" اس کے کیا معنی ۔ ؟"

منیر نیازی ہنسنے لگا اور بولا۔" یار جلیس بہت خوبصورت آدمی ہے بہت بے ضرر جھوٹ بولتا ہے۔ اور نہایت سچّائی سے گپ ہانکتا ہے۔"

یہ میرے لئے انکشاف تھا۔ اور تازیانۂ شوق بھی ۔!

انہی دنوں معلوم ہُوا کہ پیرا ماؤنٹ پکچرز کی فلم "معصوم" کے مکالمے بھی ابراہیم جلیس لکھ رہا ہے۔ اس فلم کو مشہور ہدایت کار شریف نیّر ڈائرکٹ کر رہے تھے۔

ایک دن پیرا ماؤنٹ پکچرز سے بلاوا آیا۔ میں بہت خوش ہُوا کہ وہاں جلیس ہو گا۔ یقیناً منیر نیازی بھی ہو گا۔ انہوں نے ہی بلایا ہو گا۔

میں خوش خوش پیرا ماؤنٹ پکچرز پہنچا۔ وہاں شریف نیّر سے

ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ "معصوم" کے مکالمے مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ بلکہ ایک طرح سے انکار کیا۔ اور کہا۔

"جہاں ابراہیم جلیس کام کر رہا ہو۔ وہاں میں کیونکر کام کر سکتا ہوں؟"
شریف نیر نے کہا۔ "ہم ابراہیم جلیس کے ساتھ معاہدے کی پابندی کریں گے۔ اسے پوری رقم دیں گے۔ ٹائیٹل بھی دیں گے۔ آپ کو جو معاوضہ ملے گا۔ وہ بالکل الگ ہوگا۔ اور ابراہیم جلیس بالکل متاثر نہیں ہوگا۔"

میں ان دنوں نرا پٹھان تھا۔ بات سمجھ میں نہ آئی اور چلا آیا ——

شام کو منیر نیازی ملا۔ میں نے سارا واقعہ سنایا۔ تو وہ بولا۔ "تم نے ٹھیک کیا ہے۔"

مگر جب اگلی صبح منیر ملا۔ تو جلیس بھی ساتھ تھا —— ملیا نرٹ لگا سانولا سلونا،

"چالیس کروڑ بھکاری" کا مصنّف میرے سامنے کھڑا تھا ——
وہ اپنے مضبوط، بڑے بڑے اور سفید دانتوں کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ گلے ملا۔ بولا۔

"ارے یار رحیم گل، تم نے انکار کیوں کیا۔ میں تو اپنا سارا معاوضہ

لے چکا ہوں۔ وہ شریف نیّر تو میرے مکالموں سے مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ تمہارے مکالموں سے بھی مطمئن نہیں ہوگا۔ اور آخر میں مکالمے لکھے گا احسان بی اے مگر تم رقم کیوں چھوڑو۔ پانچ چھ ہزار جو بھی ملتا ہے بٹور لو۔"

جلیس کی پیشگوئی بالکل صحیح نکلی۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی۔ تو مکالموں پر ہم تینوں کا ٹائیٹل تھا۔

اب روزانہ ملاقات ہوئی۔ جلیس کے گپ، جلیس کی بذلہ سنجی، جلیس کے قہقہے دیکھنے اور سننے کی چیزیں تھیں۔ وہ جب بے ساختہ ہنستا تھا۔ تو نہ صرف اس کے بتیس کے بتیس دانت ہنسی میں شریک ہوتے بلکہ کانوں کی لوؤں تک میں بھی دانت اُگ آتے تھے، اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں مونیٹے کی کلیاں کھل اٹھتی تھیں۔

وہ آدمی نہیں تھا سچا اور سچا قہقہہ تھا!

دوستوں کا اجتماع ہوتا۔ اور تقریباً ہر روز ہوتا۔ وہ گپ سپ کو ایک دوسرے میں اس طرح تحلیل کرتا۔ کہ بالکل سائنسی عمل بن جاتا۔ اور سائنٹیفک نتائج اخذ کرتا۔ سننے والوں کے اعصاب کو تسکین ملتی۔ اور جلیس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں میں آزار دنیا

بھول جائے۔

جب محفل گرم ہوتی۔ اور کوئی دوست اس کی گپ بازیوں میں دخل در معقولات کرتا۔ تو صرف نائنٹی نائین کہہ دینا کافی ہوتا۔ تب جلبیں "اوہو" کہہ کر فلک شگاف قہقہہ لگاتا۔

اچھا، تو تم بھی جانتے ہو ــــ ؟"

یعنی سچ اور گپ کی پرسینٹ ایج کو،

ایک بار ایک فلم ساز اس کے پاس آیا۔ فلم ساز نے کہانی سنائی۔ یہ ان کی ذاتی "محبت کی کہانی تھی۔ وہ یہ کہانی فلمانے پر بضد تھا۔ اور بطور ہیرو بھی خود کام کرنا چاہتا تھا۔ جلبیں نے پوچھا ــ "ہیروئن بھی اصلی ہوگی ــ ؟"

"نہیں بھئی نہیں۔ اصلی کیسے ہو سکتی ہے۔" فلمساز بولا "ہیروئن تو فلم انڈسٹری سے لینا پڑے گی۔ اصلی کی تو شادی ہو گئی ہے ــ دو بچوں کی ماں ہے۔ مگر میں ٹریجڈی فلم بنا کر اُسے احساس کرانا چاہتا ہوں۔ کہ جب عورت بے وفائی کرتی ہے۔ تو مرد کس طرح تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔"

جلبیں فوراً بولا ــ "مگر آپ تو ہٹے کٹے تندرست اور لکھ پتی آدمی ہیں۔ آپ کو مارنا تو بڑا مشکل ہے ــ !"

"کمال کرتے ہیں جلیس صاحب آپ بھی، فلمساز سٹپٹا کر بولا ۔
"فلم میں مرے زندہ ہو جاتے ہیں ۔ تو زندہ کیوں نہیں مر سکتے ۔ !"
ہاں ۔" جلیس نہایت سادگی سے بولا " ماردیں گے کوئی بات نہیں مار دیں گے ۔"

چنانچہ فلمساز نے فوراً ہزار روپے ایڈوانس دیئے ۔ اور تب جلیس نے اس کی ذاتی محبت کی کہانی تفصیل سے سنی ۔

شام کو ملے ۔ سارا واقعہ سنایا ۔ ہم نہ مانتے ۔ اگر اس کی جیب میں ہزار روپے نہ ہوتے ۔ سو سو روپے کے دس نوٹ نکال کر بولا ۔ بولو کیا پیو گے بیئر یا وسکی ۔۔ ؟"

میں نے کہا ۔۔" چرغہ ۔ !"
چرغہ بھی آ گیا ۔ وسکی بھی آ گئی ۔ جب دو پیگ چڑھائے تو بولا ۔
"کل عاشق صادق بغلول میاں سے کہوں گا ۔ کہانی تمہاری، مکالمے میرے، مگر سکرین پلے رحیم گل لکھے گا ۔ وہ فلم کی ٹیکنیک بہت جانتا ہے ۔ اور مرنے مارنے کے طریقے بھی خوب معلوم ہیں اسے ۔"
یقین کیجئے ۔ نائنٹی نائین کی یہ بات دوسرے دن سچ ہو گئی ۔ ایکٹر سکندر جو حاجی بغلول کے علاوہ ہم دونوں کا بھی دوست تھا ۔ مجھے

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بیت الفیام آگیا۔ جب ہم فضل بلڈنگ کے ۳۴ نمبر کمرے میں پہنچے تو وہاں فلمساز اور جلیس آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

تعارف کے بعد فلمساز نے کہا۔ "جلیس صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ کہ آپ سکرین پلے کے ماسٹر ہیں۔ یہ لیجئے ایک ہزار روپے ایڈوانس، ایسا سکرین پلے لکھئے۔ کہ فلم پچاس ہفتے سے پہلے نہ اترے ۔۔ ؟"

جلیس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ اپنا تاریخی قہقہہ کس طرح ضبط کئے بیٹھا ہے۔

خلاف معمول سنجیدگی سے بولا ۔۔ "رحیم گل سکرین پلے تو خیر تم بہت اچھا لکھو گے لیکن اصل معاملہ ہیرو کی موت کا ہے۔ ایسا کلائمکس بناؤ ایسی موت مارو۔ کہ نقل بمطابق اصل ہو۔ اور بے وفا محبوبہ کی چیخیں نکل جائیں۔ !"

میں نے اثبات میں سر ہلایا ۔۔۔ لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ اس طرح کی فلمیں بند کمرے میں پچاس ہفتے چل جاتی ہیں۔ مگر سلولائیڈ پر نہیں اترتیں ۔۔۔ یہ فلم بھی نہ بن سکی۔ حاجی بغلول کا ہیرو بغلول سے

زیادہ صاحب نظر نکلا۔ پیر صاحب نے بغلول کو منع کر دیا تھا۔ کہ فلم کا کاروبار اس کے لئے منفعت بخش نہیں ہے۔

میں نے جلیس کو کبھی سیریس نہیں دیکھا۔ وہ آزاد منش اور ہنستا کھیلتا آدمی تھا۔ جب کوئی شخص سر پر استرا پھیر کر چمکتی ہوئی ٹنڈ کے ساتھ باہر نکلتا تو جلیس کے رگ و پے میں چیونٹیاں دوڑنے لگ جاتیں۔ اور وہ مکالمہ کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ تب ہم اُسے سمجھاتے ۔۔۔ "یہ لاہوری پہلوان ہیں۔ اگر مکالمہ اسکی سمجھ میں نہ آیا تو مکالمے کا جواب دھوبی پٹڑے سے ملے گا ۔"

جلیس سرگوشی کرتا ۔۔۔ "کیا کروں میری کمزوری ہے۔ چمکتی ہوئی ٹنڈ دیکھتا ہوں تو انگلیوں میں خارش ہونے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اس کے سر پر طبلہ بجاؤں ۔"

خود جلیس کے سر پر بہت گھنے بال تھے۔ وہ کہتا ۔۔۔ "بالوں کے اسٹائل انسان کی شخصیت میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ اب دیکھئے جس آدمی کے بال گر جاتے ہیں۔ وہ اس قدرتی عیب کو کس طرح چھپاتا ہے۔ کبھی کنپٹی کے بال گنج پر پھیلا دیتا ہے اور کبھی گردن کے بال الٹا کر ماتھے پر جما دیتا ہے۔ مگر گنجا نہیں کہلانا چاہتا اور اگر غلطی سے گنجا کہہ دو تو ہاتھا پائی پر اتر آتا ہے ۔"

پھر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر کہتا ۔" یہ گنجا بھی کتنا مظلوم لفظ ہے آپ اسے ڈکشنری میں پڑھ سکتے ہیں۔ مگر عملاً اس کا استعمال ممنوع ہے۔ کتنی ستم ظریفی ہے۔ کہ آپ گنجے کو گنجا نہیں کہہ سکتے ۔!"

حلقۂ یاراں بہت وسیع اخبار نویس اُس کے دوست، شاعر اس کے دوست ادیب اس کے دوست اور تانگے والے اس کے یار،

اس کی جیب بھاری ہوتی یا ہلکی، مگر قہقہے کے وزن میں کبھی فرق نہ آتا۔ اس کے دانت ہمیشہ چمکتے ۔ اور کبھی یہ احساس پیدا نہ ہوتا۔ کہ آج جلیس پہلو تہی کر رہا ہے۔

نہایت سچّی نیّت کا آدمی تھا۔ وہ جو بخل اور خسّت کا ایک جزو ہوتا ہے ہر آدمی میں، جلیس کے حصّے میں نہیں آیا تھا۔ کم از کم میں نے نہیں دیکھا تھا ۔۔۔ جلیس میں بڑا پن نہیں تھا۔ مگر چھوٹا پن بھی نہیں تھا۔ غرور و تکبّر سے بے نیاز، اور نہ اپنے بڑے نام کا احساس،

ایک دن میں نے اس سے کہا ۔" یار جلیس، جب میں نے شروع شروع میں تمہارا نام سنا۔ اور تمہاری تصویر دیکھی ۔ تو میں تمہیں عیسائی سمجھا تھا۔ میں تمہارا نام ابراہیم جلیس کی بجائے

ابراہیم جلبیس پڑھتا تھا۔"

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور بولا۔" میں جس طرح کا مسلمان ہوں عیسائی بھی ویسا ہی ہوتا۔

میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ مگر مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ یار سچ پوچھو۔ تو اس معاملے میں میرا ذہن صاف نہیں ہے۔"

ڈیڑھ دو سال لاہور رہا۔ فلم کی تین چار کہانیاں لکھیں۔ مگر فطری لاابالی پن کی وجہ سے زیادہ عرصہ لاہور نہ رہ سکا۔ اور کراچی واپس چلا گیا۔

جلبیس جیسے بے نیاز آدمی سے خط و کتابت کی توقع عبث تھی۔ مگر جب کبھی کراچی جانا ہوا ابراہیم جلبیس سے ملاقات ضروری تھی آمنا سامنا ہوتا۔ تو کشتی کے بادبان کی طرح باہیں کھول دیتا۔ اور قہقہہ لگا کر پوچھتا۔" یار رحیم گل کب آئے۔ بزنس ٹور ہے۔ یا کوئی رومانی مہم ۔۔۔ ؟"

میں عمداً جھوٹ بولتا۔ اور دس بارہ دن سے کم نہ بتاتا۔ وہ گلے شکوے کرتا اور پوچھتا۔" کب جا رہے ہو ۔۔۔ ؟"

میں یہاں بھی جھوٹ بولتا۔ اور اسے اگلے دن جانے کی خوشخبری سناتا۔ وہ نعرہ لگاتا۔

"ناممکن — ! دعوت کے بغیر کیسے جا سکتے ہو تم — ؟"
میں فوراً سمجھوتہ کرتا اور کہتا — "اچھا تم اصرار کرتے ہو تو ایک آدھ دن رک جاتا ہوں !"

"ارے مار ڈالا — !" وہ قہقہہ لگاتا "سمجھ گیا سمجھ گیا۔ یہ گر تمہیں قتیل شفائی نے بتایا ہو گا"

پھر وہ مجھے آنکھ مارتا۔ اور دور ٹیبل پر بیٹھے ہوئے الیاس رشیدی کی طرف دیکھتا۔

"الیاس بھائی ذرا ایک نوٹ بھیجنا سو روپے کا، رحیم گل کی دعوت ہے۔ جھینگا مچھلی کی فرمائش ہے —"

پھر سرگوشی کرتا — "اچھا ہوا تم آ گئے۔ لذّتِ کام و دہن کا بہانا ہاتھ آ گیا۔"

جلیس سے آخری ملاقات غالباً ۱۹۷۳ء میں ہوئی — کسی ہوٹل میں جلیس کے صاحبزادے شہریار سے تعارف ہوا۔ شام کو جلیس ملا۔ میں نے شہریار کا ذکر کیا۔ تو اس نے اپنے انداز میں احتجاج کیا —

"ارے یار رحیم گل، کس شیطان کا نام لیا۔ بھئی وہ تو مجھے رائٹر ہی نہیں مانتا۔ آج کے نوجوان اپنے آپ کو منوانے کے

کے لئے اپنے بڑوں کو نہیں مانتے۔ مگر اس ظالم نے تو" رد کرو" کی تحریک کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ یعنی اپنے باپ کو رد کرتا ہے۔ کوئی اس احمق کو سمجھانے والا بھی نہیں۔ کہ اگر میں نہ ہوتا۔ تو بھلا تم جیسے سؤر کو جنم کون دیتا۔!"

آخر میں میں اپنے مرحوم دوست سے معذرت خواہ ہوں کہ تقریب کے موقع پر کچھ ایسی باتیں بھی رقم ہو گئیں جو ان کی زندگی میں کہی جاتیں تو اچھی لگتیں۔ کسی تعزیتی اجلاس میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں ناگفتنی کے ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ جلیس ایسی ست رنگی شخصیت کا آدمی تھا۔ کہ اس کا ذکر ہو اس کی باتیں اور سننے والوں کے دل میں گدگدی نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے۔

کہتے ہیں اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا میں کہتا ہوں جی لیا۔ بہت جی لیا۔ بہت سخت جان تھا جلیس، کہ ایسے فلک شگاف قہقہوں میں آدھی صدی جی لیا۔

سچ کہتا ہوں۔ جلیس جیسا سچا اور سچا قہقہہ ایک بھی نصیب ہو۔ پھر شریان پھٹ جائے مجھے کوئی شکوہ نہیں ہو گا زندگی سے'!

آخر میں ایک گلہ بھی کرنا جاؤں۔ کہ تم مرے تو ٹھیک وقت پر، مگر ایک حسرت باقی رہی، کہ وقتِ رفتن تمہارے بالین کے قریب ہوتا۔ اور دیکھتا۔ کہ آدھی صدی پر بکھرے ہوئے قہقہے کو موت نے کس طرح زیر کر لیا ہے۔ ؟

اور یہ بھی، کہ خندۂ مسلسل کی آبشار لوٹتی ہے۔ تو اس کا
ارتعاش کس طرح محسوس ہوتا ہے ــــ؟



مجموعۂ اضداد

ریاض شاہد مر گیا

مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ مر گیا ہے وہ تو موت کو للکارنے والے لوگوں میں سے تھا۔ وہ جلدی سے ہار نہیں مانتا تھا۔ بلکہ سرے سے ہار مانتا ہی نہیں تھا۔

پھر موت اس پر کیسے غالب آ گئی ——؟

میرا خیال ہے وہ مرا نہیں اپنے احساس کی آگ میں جل گیا ہے۔ جب پہلی بار یہ خبر سنی کہ اُس پر خون کے سرطان کا حملہ ہوا ہے تو مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ ریاض شاہد جیسے حساس آدمی کو ایسی ہی انوکھی بیماری سے دو چار ہونا تھا —— خون تبدیل کیا گیا۔ اور وہ تندرست ہو گیا وہ سرطان جیسے موذی مرض کو شکست دے چکا تھا۔

ریاض شاہد کو کہانی نویس، فلمساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے
تو سبھی لوگ جانتے ہیں لیکن میں جس رشتے سے اس کو جانتا ہوں وہ
کچھ اور ہی ہے ـــــ

میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب ہمارے ملک کی ممتاز اداکارہ
نیلو کو پولیس اس لئے سیٹ سے لے گئی کہ اُسے ایک غیر ملکی فرمان روا
کے سامنے ناچنا تھا ـــــ

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوُا کہ نہ صرف اداکارہ کے جذبات کو ٹھیس
پہنچی بلکہ فلم انڈسٹری سے منسلک ہر شعبے کے آدمی نے سبکی محسوس
کی ـــ مگر صد آفرین نیلو پر، کہ اس نے نہ صرف اپنی عزت نفس کی
حفاظت کی بلکہ پوری فلمی صنعت کی لاج رکھ لی۔

وہ سٹیج پر تو پہنچ گئی مگر ناچنے کے لئے نہیں بلکہ حکومت وقت
کے منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے لئے،

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سٹیج پر آئی اور کٹی ڈالی کی طرح گر
پڑی۔

اُسے کوئی طاقت نہ نچا سکی ـــ !

خواب آور گولیوں کی پوری بوتل نے موت کو لبیک کہہ کر زندگی
کی شان دوبالا کر دی ـــ

فلمی صنعت میں تہلکہ مچ گیا ایک کمزور اور نازک سی لڑکی نے جس شکتی، استقلال اور جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

فلمی صنعت سے متعلق قلّی سے لیکر فلمساز اور مالکان اسٹوڈیوز تک کی نگاہیں تشکر اور تفخّر کے جذبات سے معمور تھیں ــــــ

یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے ریاض شاہد کو پہچانا تھا یہی شخص تھا جو ڈھال بن کر اس نامور اداکارہ کے سر پر پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــــ

"یہ عزّت نفس کی دوستی ہے ایک فنکار سے ایک فنکار ہاتھ ملا رہا ہے اب یہ ہاتھ ناچنے کیلئے نہیں اُٹھے گا یہ ہاتھ محبت کا ہاتھ ہے!"

اور ریاض شاہد نے مرتے دم تک اس عہد کو نبھایا ــــــ

اسی ممتاز اداکارہ کے پاس ایک فلمساز گیا یہ فلمسازان فلم سازوں میں سے تھا۔ جو اداکاروں سے معاوضے کی بجائے زورِ بازو سے کام لینے کا عادی تھا مگر یہ اداکارہ جس کی انّا ایک بادشاہ کے سامنے سرنگوں نہ ہوسکی۔ ایک بزخود غلط قسم کے فلمساز کے سامنے کیونکر ہتھیار ڈالتی اداکارہ نے اس کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا ــــــ

فلمساز نے بھی اس بات کو اپنے وقار اور تمکنت کا سوال بنا لیا۔ کیونکہ آج تک کوئی اُس کے غرور کو اس طرح للکار نہیں سکا تھا۔

چنانچہ عین اس لمحے ریاض شاہد سامنے آگیا اور اس نے اس نامور اور خود دار اداکارہ کی عزت نفس کو بچانے کے لئے اس سے شادی کر لی ۔۔۔ اور یوں ایک جابر ہاتھ کو پہلی بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔

ریاض شاہد سے میرا پہلا تعارف ہفت روزہ "لیل و نہار" کے دفتر میں ہوا تھا۔ میں اُن دنوں لیل و نہار میں افسانے لکھتا تھا ریاض شاہد وہاں کام کرتا تھا میں نے دیکھا۔۔۔

وہ بڑی بے دردی سے اپنے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا تھا اور اس کی ایک آدھ انگلی سے لہو رس رہا تھا۔۔۔

اس کی اس اذیت پسندی نے مجھے چونکا دیا ۔۔۔ میں نے دل میں سوچا یہ مضطرب شخص شدت احساس کی آگ میں جل رہا ہے اور یہ معمولی آدمی نہیں ہے۔۔۔

پھر ایک دن سنا ۔۔۔ ریاض شاہد کسی فلم کے مکالمے لکھ رہا ہے جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو ہر طرف اس کے مکالموں کی دھوم تھی ۔۔۔ عام لوگ فلمی صنعت سے وابستہ ہونے کے لئے جو پاپڑ بیلتے

ہیں ریاض شاہد کو اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ فلمی صنعت تو گویا خود اس کے لئے آغوشِ شوق وا کئے منتظر تھی ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے وہ فلمی صنعت کے وڈیروں کی صف میں آ گیا ـــــ!

وہ لوگ، جنہوں نے فلمی وڈیرے بننے کے لئے عمرِ عزیز کے چالیس چالیس، پچاس پچاس سال ضائع کئے تھے اِس نووارد وڈیرے کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے مگر مجبوری تھی کہ وہ عوام میں اور بکس آفس پر بالکل پورا اترا تھا ـــــ اس لئے اُن کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود ریاض شاہد زبردستی ان کی صفوں میں گھس آیا تھا اور اپنی فطری بلند آہنگی سے سب کو مرعوب کئے ہوتے تھا ـــــ

ریاض شاہد بیحد بذلہ سنج اور مجلسی آدمی تھا ـــــ

اگر اسٹوڈیو کے کسی کونے میں آٹھ دس آدمیوں کا مجمع نظر آتا تو بلا مبالغہ آدمی کہہ سکتا تھا کہ یہاں ریاض شاہد ضرور ہو گا یا تو وہ کوئی سیاسی گتھی سلجھا رہا ہو گا اور مجمع ہمہ تن گوش محظوظ ہو رہا ہو گا ـــــ

ریاض شاہد کی ایک عادت سے ساری فلمی صنعت اچھی طرح واقف تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا تکبرّ اور مصنوعی قسم کی احساس برتری کا وہ شدید مخالف تھا غیر فطری بڑائی کا مظاہرہ کرنے والوں کو دو پلک جھپکنے میں نیچا دکھانے کا نہ صرف قائل ہی تھا بلکہ بیا اس

کا پسندیدہ کھیل تھا۔ میں ایک ایکٹر کو جانتا ہوں وہ لکڑی کا آدمی ہے اور بیدا اکڑ کر چلتا ہے پتہ نہیں یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے یا وہ جان بوجھ کر ایسا چلتا ہے لیکن ریاض شاہد کو اس کا یہ انداز رعونت بہت کھلتا تھا بہتوں کو کھلتا تھا مگر یہ واقعہ ہے کہ ریاض شاہد نے اس کا یہ بھوت اتارا۔

اب مرنے کے بعد اخبار والے لکھتے ہیں کہ یہ ایکٹر ریاض شاہد کا بڑا دوست تھا اور ریاض شاہد کے لئے اس کا سب کچھ حاضر تھا مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ ایکٹر پھر سے لکڑی کا آدمی بن گیا تو ہم اس کا بھوت اتارنے کے لئے ریاض شاہد کو کہاں سے ڈھونڈینگے؟

ریاض شاہد کی ایک عجیب وغریب عادت تھی ـــــ وہ کبھی قائل نہیں ہوتا تھا بات سچی ہو یا غلط، اس کی رائے ہمیشہ مخالف ہوا کرتی تھی، وہ پیدائشی طور پر اپوزیشن کا آدمی تھا ـــــ سچی بات کو جھوٹا اور جھوٹی بات کو سچا ثابت کرنے پر ہمیشہ اڑا رہتا تھا چونکہ زیرک اور حاضر جواب آدمی تھا اس لئے مخالف کو باتوں میں الجھا دیتا تھا اور یوں ہنگامی طور پر اس کی جیت ہو جاتی تھی۔

میرا ناول "تن تارا را" چھپا میں نے اسے ایک کتاب پیش کی ٹائیٹل دیکھتے ہی تنقید شروع کر دی میں نے صفائی پیش کی ـــــ

"رحیم گل صفحات کے اندر ملے گا۔ باہر تو فیروز سنز ہی نظر آئے گا!"

دوسرے دن شام کو ملاقات ہوئی تو گلے لگا یا کہنے لگا ــــ

"کاش! یہ ناول میں نے لکھا ہوتا یہ اس قدر خوبصورت ناول ہے کہ میں نے اسے رات ہی ختم کر دیا تھا!"

پٹھان پس منظر پر میری دو فلمیں "نغمہ دل" اور "عجب خان" بن چکی تھیں اور بکس آفس پر کامیاب بھی رہی تھیں ــــ "فرنگی" بنی تو ریاض شاہد مجھے کہنے لگا ــ

"گل بھائی، میری فلم "فرنگی" دیکھنا یہ آپ کا ٹاپک ہے آپ ہی کو لکھنا چاہیئے تھا مگر امید ہے آپ یہ فلم دیکھ کر مایوس نہیں ہونگے۔

ہم نے یہ فلم اسٹوڈیو میں اکٹھی دیکھی میں نے خلیل قیصر اور ریاض شاہد دونوں کو گلے لگایا اور مبارک باد دی۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ "فرنگی" "عجب خان" سے زیادہ خوبصورت فلم تھی۔

ریاض شاہد اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ منفی بات کیا کرتا تھا۔ اور شعوری طور پر خود کو دوسروں سے مختلف اور ممتاز گردانتا تھا نگیٹیو اپروچ کے باوجود اس کی بات کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا ــــ

یہ انداز فکر نہ صرف عملی زندگی میں تھا بلکہ فلم کے مکالموں میں بھی اس کا یہی رنگ ہوتا تھا اس کے مکالموں میں روزمرّہ نہیں، ہوا کرتا تھا وہ گھما پھرا کر بات کرنا پسند کرتا تھا لیکن اس انداز پر اس کو اتنی "قدرت" حاصل تھی کہ اس غیر قدرتی انداز تخاطب پر لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔

ریاض شاہد سینگ پھنسانے کا نہ صرف ماہر تھا بلکہ شوقین بھی تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم پیشہ ہونے کے باوجود ہم دونوں میں کبھی شکر رنجی پیدا نہ ہوئی ــــ ہم بجا طور پر ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

کسی شخص نے ریاض شاہد سے کہا ــــ

"رحیم گل آپ کے خلاف بہت باتیں بنا رہا تھا"

ریاض شاہد نے اُسے فوراً ٹوک دیا ــــ

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نے آج تک رحیم گل کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی!"

اس ایک جملے سے ریاض شاہد کے مشاہدے اور وسعت نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ظاہر ہے ایسی تیکھی اور خوبصورت بات ریاض شاہد جیسا تیکھا آدمی ہی کہہ سکتا تھا!

میں اس مضمون کا اختتام قتیل کے اس شعر پر کرتا ہوں۔ ؎

یارب حشر نہ دینا روز حساب اس کو　　　اپنی غزل کا نخشا میں نے ثواب اس کو



تنہا تنہا

بارہ چودہ سال اُدھر کی بات ہے۔ میں ایورنیو سٹوڈیو میں فلم کے کسی کام میں مصروف تھا۔ یہ میری مصروفیتوں کا اہم دور تھا۔ اس لئے ادبی کم اور فلمی آدمی زیادہ تھا۔ آج کل بھی فلموں کے لئے دو تین کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ لیکن زیادہ مصروف نہیں ہوں۔ اس لئے فلمی کم اور ادبی آدمی زیادہ بن گیا ہوں ـــــ یہ فیصلہ تو خیر آپ کریں گے۔ کہ فلمی آدمی اور ادبی آدمی میں بھاری بھر کم کون ہوتا ہے۔ کیونکہ جب میں فلمی آدمی تھا۔ تو جیب خاصی بھاری تھی۔ مگر جب سے ادبی آدمی بنا ہوں۔ جیب ہلکی ہو گئی ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ جیب ہلکی ہو تو آدمی بھی ہلکا، جیب بھاری ہو۔ تو ظاہر ہے وزن زیادہ ہو گا۔ لیکن یہ ادیبوں کی محفل ہے اس لئے جیب خالی ہونے کے باوجود ہلکا محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ غالباً یہ ادبی آدمی بننے کی برکت ہے

مگر وہ جو یار لوگ فلم کے آدمیوں کو فلمی آدمی کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ اُن سے کہوں گا۔ کہ میں واقعی کبھی فلمی آدمی تھا۔ کسی حد تک اب بھی ہوں۔ لیکن میں اس دور کو سلام کرتا ہوں۔ جب واقعی فلمی آدمی تھا۔ کیونکہ اسی دور میں ایک صاحب نے، پی کیپ پہنے ہوئے سوٹ میں ملبوس ایک شخص سے میرا تعارف کرایا۔

یہ ہیں اسرار زیدی اور یہ ہیں رحیم گل"

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بقول شخصے۔۔۔ ایک دوسرے کو پا لیا۔ اور ایک دوسرے کو فتح کر لیا۔۔۔!

وہ دن، جب میں فلمی آدمی تھا۔ اور یہ دن، جب میں ادبی آدمی ہوں۔ یعنی وہ دن اور یہ دن، ہمارا ساتھ نہ چھُوٹا۔۔۔

اس لئے کہتا ہوں۔ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ کہ میں فلمی آدمی تھا۔ کیونکہ اسی "تھا" نے تو مجھے اسرار زیدی کی دوستی عطا کی تھی۔۔۔!

مگر شاید آپ اس تعلق خاطر کو نہ سمجھیں۔ نہ مانیں۔ اور پوچھیں۔ کیا خوبیاں تھیں تم میں، کہ زیدی جیسے زود رنج نے تمہیں برداشت کیا۔ اور کیا خوبیاں تھیں۔ زیدی میں، کہ تم جیسے گم گشتہ راہ نے اُسے پیار کے قابل جانا۔۔۔؟

وہ بھی سال دو سال نہیں، پورے چودہ برس اتنے برس میں تو بن باس ختم ہو جاتا ہے اور لوگ گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ مگر تم ہو۔ کہ بیسویں صدی

کی آخری سانسوں میں بھی زندگی کی بات کرتے ہو۔ وفاکی، دوستی کی، اور پیار کی بنسری بجاتے ہو۔!؟

جو کہوں گا۔ سچ کہوں گا۔ اسرار زیدی میں ایک بھی خوبی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تضادات کا مجموعہ ہے۔ وہ سیدھا سادہ کسان نہیں ہے۔ کہ ہل جوتے اور کھیت اگائے۔ وہ دکاندار بھی نہیں ہے کہ مول تول کرے اور تجوری بھرے۔ وہ وکیل بھی نہیں ہے کہ جھوٹ سچ کا طوفان باندھ کر مقدمہ جیت جائے،

وہ انشورنس ایجنٹ ہوتا تو بھی ناکام ہوتا۔ سیلزمین ہوتا۔ تو بھی ناکامی مقدر، ڈاکٹر ہوتا۔ تو مریض اُن کے تیور دیکھ کر بھاگ جاتے۔ سیاست دان ہوتا۔ تو دفعہ ایک سو چوالیس کا اسیر ہوتا۔ کیونکہ وہ بالکل پُر اسرار نہیں ہے محض نام کا اسرار ہے!

مگر تعجب ہے۔ کہ میں پھر بھی اُسے تضادات کا مجموعہ کہتا ہوں دراصل اسرار زیدی کی سادگی بے حد پیچدار رہی ہے۔ وہ نہایت غصّہ ور ہے نہایت زود رنج، مگر نہایت صاف دل اور نہایت صاف نیت۔ وہ نہایت حساس، نہایت جذباتی، مگر نہایت صاف گو اور نہایت نیک طینت ہے۔ اور اِس لئے کہتا ہوں۔ کہ وہ تضادات کا مجموعہ ہے۔ لیکن میرے نزدیک تضادات خامی نہیں خوبی ہیں——

تضادات، جب انسان کے اندر ٹکراتے ہیں۔ تو ایک مثبت نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح، جس طرح زمین کے سینے میں مختلف کیمیائی اجزا ٹکراتی ہیں۔ تو سونا بن جاتی ہیں گیسیں بن جاتی ہیں۔ تیل بن جاتی ہیں۔ اور انسان کے کام آتی ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ تضادات شخصیت کو کھردرا ضرور بنا دیتی ہیں۔ اور بظاہر آدمی ناکام بھی ہوتا ہے۔ مگر فطری فنکار تضاد سے خالی بھی نہیں ہوتا۔ اور تضاد ہی اُس کے فن کا سر چشمہ بنتا ہے۔ گویا اسرار زیدی میں واحد خوبی یہ ہے۔ کہ مجموعہ اضداد ہے۔ چونکہ مجموعہ اضداد ہے۔ اس لئے وہ فطری فنکار ہے ــــ!

لہٰذا اب میں اس روشنی میں بات کو آگے بڑھا سکتا ہوں۔ کہ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی ایبنارمل نہیں ہے، تو وہ فنکار بھی نہیں ہے۔ یہ سیدھی سادی حقیقت ہے۔ کہ کوئی شریف آدمی تیکھی بات نہیں کہہ سکتا۔ کہے گا۔ تو اس کی شرافت خطرے میں پڑ جائے گی۔ منیر نیازی کو دیکھئے۔ کتنا مشکل آدمی ہے۔ مگر شعر کتنے خوبصورت کہتا ہے۔ مجید امجد کو یاد کیجئے کس قدر تنہا اور دکھی آدمی تھا۔ مگر کیا کیا گیت پیارے چھوڑ گیا ہے آپ کیلئے، منٹو کا تیکھا پن اور کھردرا پن تو مشہور تھا۔ مگر اس کے اندر کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں۔

میں اوپر کی مثال پھر دہراتا ہوں۔ کہ زرخیز مٹی سے آپ صرف فصل اگا سکتے ہیں۔ لیکن زر و جواہر آپ کو اس زمین سے ملیں گے۔ جس کی سطح کھردری ہو ــــ!

تو دوستو ــــ ایک کھردری شخصیت آپ کے سامنے بیٹھی ہے یہ کھردرا پن ہی ہے۔ کہ میں اس سے منسلک ہوں۔ یہ ہموار آدمی ہوتا ــ بالکل سپاٹ، تو میں کبھی کا پھسل گیا ہوتا۔ دُور چلا گیا ہوتا ان سے۔ لیکن میں اپنے تجربے، اپنے مشاہدے کی روشنی میں ان کا ہمزاد بنا پھرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے۔ ایک دن یہ کھردری چٹان شق ہو جائے گی۔ زر و جواہر باہر آجائے گا۔ اور لوٹنے والا اکیلا میں ہوں گا۔

یہ تو خیر میں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ اسرار زیدی ناکام آدمی ہے۔ ناکام ان معنوں میں، کہ نہ کار ہے نہ کوٹھی ہے نہ کرسی اور نہ بینک بیلنس، ان معنوں میں تو میں خود بھی ناکام آدمی ہوں۔ مگر خدارا کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے۔ کہ ہماری دوستی کی بنیاد بھی اس قدر مشترک پر استوار ہوئی ہے۔ کیونکہ دوستی کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ بلکہ اسرار زیدی اس لئے ناکام آدمی ہے۔۔ اپنی [illegible] میوں کی طرح سچ بولنے کے آزار میں مبتلا ہے سچ وہ عذاب ہے کہ [illegible] سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ اور ایک دن آتا ہے آدمی بالکل تنہا رہ جاتا ہے۔

"تنہائی کی بات آگئی۔ تو بتادوں کہ اسرار زیدی پبلک ریلیشننگ جس کا اردو ترجمہ غالباً تعلقات عامہ ہے ۔ سے بالکل عاری ہیں۔ میں حیران ہوں۔ وہ کیسے دل گردے کے لوگ ہیں جنہوں نے اس محفل کا اہتمام کیا۔ اور ایک تنہا آدمی کو اس اجتماع میں لے آئے۔

اب بات چلی تو چلتے دو۔ بتاتا چلوں۔ کہ اسرار زیدی تعصب کی حد تک سوشلسٹ ہے۔ لیکن اسکے کردار کی خصوصیت دیکھئے۔ کہ وہ کٹر مذہبی آدمی بھی ہے اور ادھر میرا کردار، کہ نہ کٹر مذہبی آدمی ہوں۔ اور نہ کمیونسٹ مگر دوست اس کمیونسٹ کا ہوں۔ کبھی کبھی ہمارا جھگڑا بھی ہوتا ہے۔ سیاست اور نظریات کا جھگڑا ۔۔

اسرار زیدی کہتا ہے۔ کمیونزم انسان کے دکھوں کا آخری اور حتمی علاج ہے۔ میں کہتا ہوں، دو سو سال یا پانچ سو سال کے بعد کمیونزم رد ہو جائے گا۔ جمہوریت بھی رد ہو جائے گی۔ کوئی اور ازم آئے گا۔ جو ان سب سے برتر ہوگا ۔۔ یہ سائنسی نظام ہوگا۔ یا مابعد الطبعاتی، یا دونوں کا امتزاج، بہر حال انسان ضرور سکھ کا سانس لے گا۔

تب اسرار زیدی کہتا ہے ۔۔ "تم رجعت پسند ہو۔ !" میں یہ الزام قبول کرتا ہوں۔ کیونکہ میں روس اور امریکہ کے آدمی سے زیادہ خوشحال آدمی کا خواب دیکھ رہا ہوں۔

سیاست میں بھی اسرار زیدی پینگ پھنسا تا ہے۔ اور اس بری طرح پھنساتا ہے۔ کہ ضدی ٹریفک کنسٹیبل کی طرح ساری ٹریفک جام کر دیتا ہے۔ وہ جس لیڈر سے عقیدت رکھتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی الزام سننے پر آمادہ نہیں، جس سیاست پر یقین رکھتا ہے، اس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا ایسا ہوا کہ بحث آگے بڑھی۔ اور وہ روٹھ گیا۔ اور ایسا روٹھا۔ کہ منانے میں پورے اکیس دن لگے۔

آپ ان کے اس رویے کو خامی کہیں کمزوری کہیں، میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ اپنے نظریات سے عقیدت اور ان پر اٹل رہنا ان کی سرشت ہے۔ وہ اگر سیاست میں اپنے لیڈر پر بہتان برداشت نہیں کرتا۔ تو دوستی میں اس سے بھی دو قدم آگے۔

یقین نہ آئے تو آزمالیں۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے خلاف زبان کھول کر دیکھیں۔ وہ کپڑے پھاڑ کر آپ کی تردید کرے گا۔ رحیم گل کے خلاف بولیں۔ وہ پوری قوت سے آپ کو رد کرے گا!

کون ہے اس دور میں، کہ دوستوں کے لئے لڑے، ان کی غیر حاضری میں ان کا دفاع کرے — مجھے کہنے دیجئے۔ یہ کام اسرار زیدی جیسا کوئی سادہ دل ہی کر سکتا ہے — !

ایک بات اور بتاؤں۔ کوئی نیا آدمی اسرار زیدی سے ملتا ہے۔ تو سخت

مایوس ہوتا ہے۔ اس رند بے ریا کا رد یہ اجنبی اور دوستوں سے ایک سا ہوتا ہے زیادہ رہے۔ رند بے ریا میں رند کا لفظ میں نے محض محاورتاً استعمال کیا ہے) یعنی آپ ان سے ملنے جائیں گے۔ تو ایک خشک "آیئے" کے سوا کچھ نہ ملے گا نہ لبوں پہ مسکان کا تحفہ آنکھوں کی چمک کا نذرانہ ایک اذیت ناک خاموشی کے بعد پوچھیں گے ۔ چائے ۔ ؟"

ظاہر ہے کہ آپ انکار کریں گے۔ مگر وہ اس کے لئے دوبارہ اصرار نہیں کریں گے۔ تنگ آکر جب جانے کے لئے اٹھیں گے۔ تو وہ بے ساختگی سے کہیں گے ۔ بیٹھو یار کہاں جاؤ گے !"

تب آپ کو احساس ہوگا۔ کہ سخت اور کھردرے اخروٹ کے اندر ملائم اور لذیذ گری ہوتی ہے ۔ اور یہ بھی کہ یہ کوسوں دور بیٹھا ہوا آدمی اور میرے درمیان صرف ایک چھوٹی سی تنہائی حائل ہے۔ رفتہ رفتہ یہ فاصلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس تنہا آدمی کو آپ اپنے دل کے بہت قریب پاتے ہیں۔ تب آپ پہ یہ راز بھی افشا ہوتا ہے۔ کہ جو لوگ دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہوتا ہے ۔ کہ کاتب تقدیر ان کی ہسٹری تسبیٹ میں سچ کا لفظ سرخ سیاہی سے لکھ دیتا ہے — !

بارہا کہا — زمانے کے ساتھ چلو۔ جدھر کی ہوا ادھر کا رخ ، آندھی آئے تو گھاس کی طرح لیٹ جاؤ۔ آندھی گزر جائے تو دوبارہ سر اٹھا کر سر بلند ہو

جاؤ۔"

جواب ملتا ہے ۔" سچ کو آنچ نہیں ۔"

میں کہتا ہوں ۔" وہ زمانے اڑ گئے جب چاند پر بڑھیا بستی تھی ۔ کہاوتیں مر گئیں ۔ روایتیں بجھ گئیں ۔ چاند کا سفر سچ کے جادو سے نہیں آکسیجن سے ہو گا ۔ !"

تب اسرار زیدی ناداں بچے کی طرح حیراں و پریشاں ٹٹ بٹ دیکھتا ہے ۔ اور سوچتا ہے ۔ یہ کیسا دور آ گیا ہے ۔ کہ استاد شاگردوں کو سچ پر شعور کی فوقیت کا سبق دیتے ہیں ؟

وہ نیکی کی شکست کا تصوّر ہی نہیں رکھتا ۔ وہ مسلسل تاریکی پر ایمان ہی نہیں رکھتا ۔ وہ سمجھتا ہے ایک دیا جل رہا ہو ۔ اور ایک ہزار ایک اندھیروں کا اجتماع ہو ۔ یہ سب اندھیرے مل کر بھی اس دیئے کی روشنی نہیں بجھا سکتے ۔ !

نہ سہی صدارت نہ سہی وزارت آدمی خدا نہ بن سکے ۔ انسان تو بنے ۔ بس یہی اسرار زیدی کا المیہ ہے ۔ جب وہ انسانوں کے جنگل میں بھٹکتا ہے ۔ اور انسان سے انسان کے بے گانگی دیکھتا ہے ۔ تو بسمل کی تڑپ دیدنی ہوتی ہے ۔ یہی وقت ہوتا ہے ۔ کہ وہ احساس کی چکی میں پستا ہے ۔ اور تنہائی کا شیش ناگ اپنی دو شاخی زبان سے اس کا لہو چاٹتا ہے ۔

اسرار زیدی یہ سب ظلم سہتا ہے۔ سانے ستم اٹھاتا ہے مگر یہ شخص جو مجھے رجعت پسند کہتا ہے خود اس کی رجعت پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ پھر بھی انسان سے مایوس نہیں ہوتا۔ اور شدید تنہائی کے احساس کے باوجود کسی بھلے لمحے کا منتظر ہے۔!

چونکہ میرے مضمون کا عنوان ہے "تنہا تنہا" اس لئے تنہائی کا ذکر بار بار آئے گا۔ بتاتا چلوں۔ کہ زیدی کی تنہائیوں کے کئی روپ ہیں۔ پہلی تنہائی تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر آگیا ہے۔ یہ تنہائی اسے سچ کے واسطے سے ملی ہے۔

دوسری تنہائی سیاسی ہے یعنی وہ جن جوان کے نزدیک حرف آخر تھی۔ حرف اوّل سے بھی گئی گزری نکلی۔ ظاہر ہے ان کی عقیدت کو نقصان پہنچا اور دائرہ مزید تنگ ہو گیا۔

تیسری تنہائی معاشرتی ہے۔ روزانہ ایسے سانحوں سے دوچار ہونا ایسے ایسے لطیفے سنتا ہے گویا ہم لوگ صبح نفرتوں کی فصل بونے ہیں۔ اور شام کو کاٹ لیتے ہیں۔

چوتھی تنہائی تہذیبی ہے۔ اسرار زیدی انار کلی میں رہتا ہے۔ یعنی لاہور کے دل میں، وہاں سب کچھ ہے۔ تہذیب بھی، ادب بھی، نفاست بھی، مگر یہ دل حرارت سے خالی ہے۔

پانچویں تنہائی زود حسی ہے، اسرار زیدی بہت زود رنج ہے۔ اتنا

حسّاس، کہ ذرا سی چتون کی شکن سے مخاطب کے دل کی بات پا لیتا ہے۔ اور محفل سے اُٹھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا کوئی دوست نہیں۔ یہ کمال صرف مجھے حاصل ہے۔ کہ ایک ہزار ایک شکر رنجیوں کے باوجود چودہ سال سے ان کے ساتھ ہوں۔

چھٹی تنہائی جنسی ہے ۔ خدا جانے وہ کتنی مدّت سے تنہا ہے۔ چودہ برس سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس موضوع پر کسی کو اعتماد میں نہیں لیتا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کہ محبت کے بارے میں وہ کتنے عظیم المیئے سے دوچار ہوا ہے۔ اور کیا عجب' ان ساری تنہائیوں کا منبع خود یہی تنہائی ہو ۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ہر خدشے کو نظر انداز کر کے اور ہر اعتراض کو رد کر کے اعتراف کے انداز میں اپنے ذاتی واردات کی کہانی لکھیں۔ تو وہ شاہکار ہو گی۔!

ساتویں تنہائی غم روزگار ہے ۔ اسرار زیدی اگر افسر ہوتا تو مجید امجد کی طرح ساری زندگی ایک کمرے کے کوارٹر میں گزارتا۔ کیونکہ اس اس کی ہسٹری شیٹ میں تو روز ازل سے " سیج " کا لفظ سرخ سیاہی سے لکھا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سیج اُسے کوارٹر ہی دے سکتا تھا ۔ بنیادی طور پر وہ ادیب ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ادب اور روٹی کا خدا واسطے کا بیر ہے۔ مگر پیٹ کے لئے

کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں۔ جب کبھی فاقوں کی نوبت آئی۔ تو اس نہیں لاکھ کے شہر میں مجھے اسرار زیدی ہی نظر آتا۔ اسرار زیدی کی مالی حالت جاننے کے باوجود سیدھا وہاں پہنچتا اور خفت بھری مسکراہٹ سے کہتا۔ "یار آج تو فاقہ ہے!"

اچھا۔!" وہ چونکتا۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں، دو چار لمحے سوچتا۔ اور پھر یہ کہہ کر سیڑھیاں اتر جاتا۔" ابھی آتا ہوں۔"

اور پھر انار کلی کے اژدھام میں جانے کس کو کندھا مارتا کس کی جیب کاٹتا مگر واپس آتا۔ تو اس کے ہاتھ میں چند کرارے نوٹ ہوتے۔ یوں آئی بلا ٹل جاتی اسی طرح جب اسرار زیدی پر کڑا وقت آتا ہے تو جانے کیوں انار کلی کے اژدھام میں کندھا مارنے کی ہمت نہیں پاتا۔ سیدھا میرے پاس آتا ہے وہی خفت بھری ہنسی، جو کل میرے ہونٹوں پر تھی۔ آج اس کے چہرے پر سجی ہوئی ہے۔" یار آج تو فاقہ ہے!"

پھر جو کچھ بن سکا یعنی جو کام میں اپنے لئے نہیں کر سکتا تھا۔ اسرار زیدی کیلئے کر جاتا۔ کیونکہ انار کلی کی طرح میکلوڈ روڈ پر بھی خاصا اژدھام ہوتا ہے اور کندھا مارنے کیلئے آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی یوں ہم دونوں کا کام چلتا ہے۔ چلنے سے یاد آیا۔

وہ جو کہتے ہیں۔ چلتی کا نام گاڑی، ہمارے بھی کچھ دوست ہیں۔ جن کی

گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی چلنے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کامیابی بے وجہ نہیں ملتی۔ کہتے ہیں نا، میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ تو ہمارے دوست اسی اصول کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ کہ کار حیات ہمارے لئے، بار حیات آپ کے لئے، ہیں اور اس راز پر ہی حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اس کے کیا معنی؟ جواب ملتا ہے کام دام ہمارے لئے۔ رام نام آپ کے لئے۔

یہ حصے بخرے اور بندر بانٹ دیکھ کر ہماری حیرت دُور ہو جاتی ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ احباب کا رویہ بھی وہی ہے۔ جو کاتب تقدیر نے ہمارے لئے مقدّر کر رکھا ہے۔

کچھ کائیاں دوست ایسے بھی ہیں کہ کاتب تقدیر خود ان کا پانی بھرتا ہے۔ وہ کیا خوب کہا ہے۔ علامہ نے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو دوستو۔۔۔ ہمارے ان احباب کی خودی واقعی اتنی بلند ہے کہ حد فراز عبور کر گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاتب تقدیر ان کا پانی بھرتا ہے۔ اس رعایت سے انھوں نے اپنی آنکھوں میں ایسی ایکسرے مشین فٹ کر لی ہیں۔ کہ جب بھی غرض کی چادر اوڑھ کر در نیاز پہ حاضری دی۔ انہیں فوراً ہماری جیب طلب

کے عنوان کا علم ہو گیا۔ چنانچہ ایسی تمہید باندھی کہ چلّو بھر پانی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ چائے کی پیالی موجود ہے۔ آپ اس میں بھی غوطہ لگا سکتے ہیں۔ اسرار زیدی اور میں ایسے کئی غوطے لگا چکے ہیں۔ بھلا ہو ان دونوں کا، کہ اپنی ایکسرے مشینوں کی مدد سے دل کا چور پکڑ لیتے ہیں اور ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اور یوں آدھی شرمندگی سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں۔ اگر ہم پوری شرمندگی کا مقابلہ کر سکتے۔ تو شاید خدا کو بھی ضرورت پڑ جاتی۔ کہ اپنے ان دو بندوں سے پوچھتا "مانگ کیا مانگتے ہو — !"

مگر سچی بات یہ ہے۔ کہ جب ہم جانتے ہیں۔ کہ کارِ حیات کس طرح چلتا ہے۔ کام دام کس طرح ملتا ہے۔ ایکسرے مشین کس طرح الاٹ ہوتی ہے اور پھر بھی الاٹمنٹ آرڈر حاصل نہیں کر سکتے۔ تو گلہ شکوہ کیوں کریں گے صاف تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ کہ ہم نااہل لوگ ہیں۔ اور ہوا کا رخ نہیں پہچانتے۔

اگر اسرار زیدی نہیں مانتے۔ نہ مانیں۔ میں تو اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود عطاء الحق قاسمی سے توقع رکھتا ہوں۔ کہ اگر تم نے اسرار زیدی جیسے تنہا تنہا آدمی کے ساتھ شام منا کر ثواب

کمایا ہے۔ تو کبھی کبھار نالائقوں کے ساتھ بھی شام مناکر ثواب دارین حاصل کریں۔



(خاطر غزنوی)

انسائیکلو پیڈیا

میں نے پاکستان میں دو آدمی ایسے دیکھے ہیں جو کتابیں اوڑھ کر سوتے ہیں!

یہ دونوں شاعر ہیں۔

ایک پنجابی زبان کا، دوسرا اردو زبان کا،

ایک کا نام استاد دامن ہے۔ دوسرے کا نام خاطر غزنوی ہے۔

ایک لاہور میں رہتا ہے۔ دوسرا پشاور میں۔

ایک لحیم شحیم ہے۔ دوسرا دبلا اور پھر پتلا۔

جب پہلی بار میں استاد دامن کے کمرے میں گیا۔ تو ایسا محسوس ہوا۔ کتابوں کی تہ میں ایک زندہ آدمی دفن ہے۔ علیک سلیک ہوئی۔ دو چار منٹ گزرے تو ایسا لگا۔ گویا کتابیں بولنے لگی ہیں۔ ورق ورق محو گفتگو ہے۔

تب سمجھ آئی۔ کہ یہ ضخیم ضخیم کتابیں محض نمائش کیلئے نہیں ہیں۔ استاد دامن ان کا لفظ لفظ گھول کر پی گیا ہے ـــــ!

اسی طرح کا اچنبھا خاطر غزنوی کے کمرے میں بھی مجھے ہوا تھا۔ یہاں تو دیواریں ہی سرے سے غائب تھیں۔ فرش سے عرش تک کتابوں کی کئی کئی دیواریں کھڑی تھیں ـــ

فکشن الگ، سائنس الگ، تحقیق الگ، تنقید و تبصرہ الگ، نظم و غزل الگ، بیچ میں خاطر غزنوی کا پلنگ، جس کے چاروں طرف قبر کی کلغیوں کی طرح کتابوں کے مینار کھڑے تھے ـــ پھر ایک اور سٹور نما کمرہ، کتابیں ہی کتابیں، رسائل ہی رسائل،

ڈرائینگ اور بیڈ روم کی الماریاں الگ، جہاں نہایت قرینے سے خوبصورت کتابیں سجی ہوئی تھیں ـــ کوٹھی کے پچھواڑے جھانکا۔ تو بے اختیار الا مان کی صدا نکلی۔ برآمدے میں وہی کتابوں کی دیواریں ـــ

یا خدا ـــ یہ مختصر قد کاٹھ کا آدمی، اور منوں ٹنوں کے حساب سے کتابیں، پچاس یا دن کا سن، سانسوں کی گنتی۔ اور ہزاروں کتابوں کے الفاظ۔ جانے کس کی تعداد زیادہ ہوگی ـــ؟

گویا لاکھوں کروڑوں الفاظ کا مفہوم اس کی سانسوں میں رچا ہوا ہے۔

میں نہیں بتا سکتا۔ کہ وسعت مطالعہ کی شدت سے روح بوجھل ہو جاتی ہے۔ یا روح میں گلاب کھل اٹھتا ہے ۔۔ ؟

کیونکہ خود میرا تجربہ ہے۔ کہ بعض اوقات اچھی کتاب پڑھ کر انسان سرشار ہو جاتا ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں۔ کہ انسان شکوک و شبہات میں گھر جاتا ہے۔ اور آگہی کے اندھیرے اسے پاتال کی سمت ڈال دیتے ہیں ۔۔۔

میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ خاطر میری طرح کے واردات سے دوچار ہوا ہے یا نہیں۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ کثرت مطالعہ نے اسے کتنی خانوں میں بانٹ دیا ہے۔

غزل اور نظم اس نے کہی فکشن اس نے لکھا۔ ڈرامہ اور تنقید کو اس نے اپنایا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے اس نے لکھا ۔۔۔ مختلف زبانیں اس نے سیکھیں سنجیدہ مضامین اس نے لکھے۔ مجلسی زندگی میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔ ادبی سیاست میں ہمیشہ نمایاں رہا ۔۔۔ فوٹو گرافی میں اس نے کمال حاصل کیا۔ ادبی پرچے کی ادارت اس نے کی۔ اور پروفیسری اس پر سوا ۔۔۔ ! بنیادی طور پر وہ شاعر ہے۔ اگر وہ صرف شاعری کرتا۔ تو بہت نمایاں ہوتا۔ نمایاں تو وہ اب بھی ہے۔ مگر اسے جو مقام ملنا چاہیئے تھا۔ میں سمجھتا ہوں۔ کثرت کار نے اُسے وہاں تک پہنچنے نہیں دیا ۔۔۔

خاطر بے حد دلچسپ آدمی ہے۔ وہ عام شاعروں اور ادیبوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کے مشغلے، اس کی ہابیاں عجیب وغریب ہیں۔

فوٹوگرافی کا ذکر تو میں نے کر دیا ہے۔ خود تصویر اتارتا ہے، خود ہی ڈویلپنگ اور خود ہی پرنٹنگ کرتا ہے۔ پروفیشنل نہیں ہے۔ مگر پروفیشنل فوٹوگرافروں کی طرح ڈارک روم بنا رکھا ہے۔ انلارجر رکھا ہوا ہے۔ فوٹوگرافی کی تمام باریکیوں اور میم میخ سے واقف ہے۔

ایک اور مشغلہ، کم از کم پاکستان میں خاطر واحد آدمی ہے۔ جو تاش کے جوکر جمع کرتا ہے۔ کسی گھر میں ایک جوکر ہو۔ تو زندگی کتنی رواں اور شاداں رہتی ہے۔ مگر خاطر کے گھر میں تو ہزاروں جوکر ہیں۔ ایک سے ایک مختلف کبھی پشاور یونیورسٹی جانا ہو۔ تو اس کے خوبصورت گھر کا حسن اور شادمانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

کیلنڈر کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، مبالغے سے کام نہ لوں۔ تو کہہ سکتا ہوں ـــ اس کے پاس ہزاروں سے بڑھ کر کیلنڈر ہیں۔ صرف کیلنڈر ہی نہیں، بلکہ کیلنڈر کا انتخاب کہئیے۔

کوئی دیدہ زیب کیلنڈر جو اس ملک میں چھپا ہو۔ خاطر کے پاس یقیناً موجود ہو گا۔ بیرون ملک کے خوشنما کیلنڈر بھی خاطر کے دست برد سے نہیں بچ سکتے۔

ہیں جب خاطر کے مشاغل پہ غور کرتا ہوں۔ تو مجھے اس پس منظر میں ایک معصوم شاعر نظر آتا ہے ۔۔۔ شاعر جو حسن کا متلاشی ہوتا ہے۔ جو حسن پہ جان دیتا ہے ان سب چیزوں میں بھی کہیں نہ کہیں حسن کارفرما ہوتا ہے۔ شاعر اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے مستفیض ہوتا ہے۔ تاش کے بعض ٹائیٹل کس قدر دلکش ہوتے ہیں۔ کیلنڈر کی تو خوبی ہی اس میں ہوتی ہے۔ کہ نظر پڑے تو جم کر رہ جائے۔ مجھے یقین ہے۔ خاطر غیر شعوری طور پہ ان چیزوں سے حظ اٹھاتا ہے۔

میرا خیال ہے۔ اگر سانپ کے منہ میں زہر کے پیالے نہ ہوتے۔ تو خاطر سانپ بھی پالتا۔ اور دنیا کا ہر سانپ اس کی پٹاری میں موجود ہوتا ۔۔۔ اگر وہ مالی طور پہ آسودہ حال ہوتا۔ تو دنیا کے ہر رنگ کا طوطا اس کے گھر کے برآمدے میں آویزاں ہوتا ۔۔۔ اگر حالات اجازت دیتے تو سمندر کے ہر رنگ کی مچھلی اس کے شیشہ گھر میں تیرتی نظر آتی ۔۔۔ اگر وقت اجازت دیتا۔ تو روئے زمین کی ساری بلبلیں خاطر کے گھر میں نشیمن بناتیں۔

یہ اس کی افتاد طبع ہے۔ کہ ہر حسین چیز سے پیار کرے ۔۔۔
بات تشنہ رہے۔ اگر خاطر کے ٹیپ ریکارڈر کا ذکر نہ کیا جائے۔ ٹیپ ریکارڈر تو بہت لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔۔ نمائش

کی خاطر، یا گانے سننے کے لئے، لیکن ٹیپ ریکارڈر کا صحیح مصرف خاطر جانتا ہے۔

پشاور کی کوئی تقریب ہو۔ خاطر کے ٹیپ میں محفوظ ہو گی۔ پشاور ہی پر کیا موقوف، دنیا کا کوئی گوشہ ہو۔ کوئی قابل ذکر آواز اٹھے ــــ تو سمجھو، خاطر کے ٹیپ نے اُسے ہضم کر لیا۔

دنیا کی نہایت چیدہ چیدہ اور انتہائی نمائندہ شخصیتوں کی آواز اس کے ٹیپ میں بند ہے ــــ تقسیم ہند کو لگ بھگ تیس برس ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں برعظیم کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر پاکستان نہیں آئے لیکن کرشن جی کی نہایت خوبصورت آواز خاطر کے پاس محفوظ ہے۔ ظاہر ہے اکاش وانی سے ان کا انٹرویو نشر ہو رہا تھا۔ کرشن جی نے پطرس مرحوم کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی تھی۔ خاطر کو خدا جانے ایسی خوبصورت باتوں کا پتہ کس طرح چل جاتا ہے۔ فٹ سے ٹیپ کر دیا۔

میں نے کرشن جی کی یہ گفتگو خاطر کے ہاں سنی۔ تو روح میں ایک انوکھا گداز محسوس کیا ــــ پطرس کی باتیں اور کرشن جی کی زبانی، بالکل دو آتشہ شراب کی سی کیفیت تھی ــــ تب مجھے ان دونوں کے ساتھ خاطر پر بھی پیار آ گیا۔ کہ یہ خوشی اس کی وجہ سے عبارت تھی۔

اور مجھے ان لوگوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ جو خاطر کی جا و بے جا مخالفت

کرتے ہیں مگر یہ بات بھی سمجھ گیا تھا کہ فتو اور گامے کی مخالفت کوئی کیوں کرے گا۔ ایسا ہمہ دان آدمی، جسے پلکوں پر بٹھانا چاہیئے۔ یقیناً حسد کا شکار ہی ہو گا۔ کہ قدرت نے اُسے دوسروں سے ممتاز بنایا ہے۔

یہ کہنے میں کوئی باک نہیں۔ کہ خاطر اپنی ذات میں انجمن ہے۔ وہ چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہے ـــــ کہ صفحہ الٹو۔ تو نیا مضمون، ورق ورق میں حیرت و استعجاب کا جادو ـــــ

مگر اس پر بھی ان کی بیگم کو گلا ہے۔ کہ یہ جو کتابوں کی مینار یں اور دیواریں کھڑی ہیں۔ میرے کس کام کی، میرے بچوں کے کس کام کی۔! مجھے تو ان دیواروں کے اوپر ایک چھت بھی چاہیئے تھا۔ اور کاغذ کی دیواریں چھت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں ـــــ!!

ان کی بیگم کہتی ہیں ـــ کہ ہر کتاب کی جگہ ایک اینٹ آتی۔ تو آج میں ایک خوبصورت مکان کی مالک ہوتی۔ اور ہر کتاب کی قیمت کی جگہ اینٹ آتی۔ تو ایک کی بجائے تین مکانوں کی مالک ہوتی ـــــ!

اب انہیں کون سمجھائے۔ کہ اینٹ گارے کے مکان ایک دن گر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ مگر سچا شاعر کبھی نہیں مرتا۔

یا یوں کہیئے۔

کہ اینٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ لفظ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ لکڑی کے دروازے

اور شمشیر کو دیمک چاٹ جاتی ہے۔ مگر الفاظ کو ہضم نہیں کر سکتی۔ فولاد کے چھت بھی زنگ آلود ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر کاغذ پہ لکھا ہوا شعر کبھی نہیں مرتا۔

اس لئے میں کہتا ہوں۔ کہ وہ شعر جو شعوری کوشش کی بجائے روح کی گداز سے جنم لیتا ہے۔ محلّوں اور اٹاریوں سے کہیں افضل ہے۔ چونکہ شعر افضل ہے۔ اس لئے شاعر بھی افضل ہے۔

اور اگر خاطر بھی انہیں شاعروں میں سے ہے۔ اور یقیناً ہے۔ تو میں انہیں سلام کرتا ہوں ــ!



میرا دوست میرا دشمن

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میری اردو فلم عجیب خان ریلیز ہوئی تھی۔ یہ اغلباً ۱۸، ۱۹ سال پہلے کی بات ہے۔ یہی عمر میری اور ایوب صابر کی دوستی اور دشمنی کی بھی ہے۔!

ہوا یوں، کہ ماسٹر خان گل مرحوم کے اخبار بانگ حرم میں ایوب صابر کالم لکھتے تھے۔ تب میرا ان سے تعارف نہیں تھا۔ فلم عجیب خان ریلیز ہوئی۔ اور فلمی اصطلاح کے مطابق پورے ملک میں ہٹ ہوئی۔ مگر ایوب صابر نے اپنے کالم میں فلم پر تنقید کی۔ اصولی طور پر ان کی تنقید درست تھی۔ کیونکہ فلمی تقاضوں کے پیش نظر میں نے کم و بیش مبالغے سے کام لیا تھا۔ اور وہ انہیں ناگوار گزرا تھا۔

مگر بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ میرے کسی رشتہ دار نے بانگ حرم

کا متعلقہ پرچہ مجھے لاہور بھیج دیا۔ یوں ایوب صابر کا نام میرے ذہن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

مگر اس تنقید نے جسے میں اصولی طور پہ درست سمجھتا تھا۔ تقریباً ایک یا دو فیصد کے اندازے سے میری انا کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ میں نے بانگ حرم کو ایک طویل خط لکھا۔ ظاہر ہے۔ اپنی صفائی میں، اپنی مدافعت میں ہو گا شیطان بھی اگر اپنی صفائی پر اُتر آئے تو نعوذ باللہ، خدا کو حیرت میں ڈال سکتا ہے!

بانگ حرم میں یہ خط چھپ گیا۔ میری انا کو کچھ تسکین ملی۔۔۔ مگر اب بحث کا ایک نیا باب کھل گیا۔ پشاور کی باتیں لاہور منتقل ہو گئیں۔ اور نسیم حجازی کے اخبار کوہستان میں زوردار بحث چل نکلی۔ دس خط میری حمایت میں، تو دس خط ایوب صابر کی حمایت میں، بحث زلف یار کی طرح دراز ہوتی چلی گئی۔ اس ہنگامے سے فلم کو بہت تشہیر ملی۔ اور تقسیم کار کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایوب صابر کو کیا ملا۔۔۔؟

دل ہی دل میں ایوب صابر کی سادگی پر خوش ہو رہا تھا۔ کہ میں نے اس مرد درویش کو ٹھگ لیا ہے۔۔۔ چہ جائیکہ سجدہ سہو کرتا۔ شیطان پہلو بچا کر نکل گیا۔۔۔!

ایوب صابر سے پہلی ملاقات بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔

کچھ خانگی امور کے سلسلے میں کوہاٹ جانا ہُوا۔ گھومتے پھرتے لائبریری چلا گیا۔ ایک ٹیبل پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دستِ ناآشنا نے تپاک سے میرے کندھے کو چھو لیا۔۔۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ ایک سانولا، گول مٹول سا چہرہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ آنکھوں میں خوش آمدید، مجھ سے مخاطب تھا۔

"غالباً آپ رحیم گل ہیں ۔ ؟"

"جی درست ۔!" میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

ایوب صابر نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ۔"میرا نام ایوب صابر ہے!"

میں نے مسکرا کر اس جنگل خیلی کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا۔

"میں تو تجھے آسمانوں میں تلاش کر رہا تھا۔ اور تم مجھے لائبریری میں مل گئے ہو!"

شاید ایوب صابر کی چھٹی حس نے بھی میرے دل کی بات بوجھ لی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس نے میرے وار سے بچ نکلنے کے لئے نہایت محبت سے چائے کی پیش کش کی اور میں جو فطرتاً محبت گزیدہ ہوں۔ چپکے سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

چائے آ گئی ۔۔۔ کوہاٹ کے پانی کی چائے، کہ لاہور میں کبھی نصیب نہ ہوئی ۔ اور اس پر دودھ چینی سوا۔ میں دودھ پی کر دودھ بھائی بننے کا

قائل ہوں۔ اور چینی، کہ جس سے حلوہ بنتا ہے۔ اور حلوہ مجھے پسند ہے
لوگ نمک کھا کر نمک حلالی کرتے ہیں۔ میں حلوہ کھا کر حلوہ حلالی کا
قائل ہوں ۔!

اگر اہل ادب کو محاورے کی شہادت پر اعتراض ہے۔ تو معافی
چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنی فطرت کو شہید نہیں کر سکتا۔ اور پھر یوں بھی
حلوہ آج کل قومی علامت بن چکا ہے! حاکم، حلوہ خوروں پر حلوہ خوری
کی طنز کرتا ہے۔ سامنے سے سیدھا سادہ جواب آتا ہے۔

"حلوہ شراب سے بہر طور بہتر ہے!"

تو دوستو — یوں میں سلسلہ در سلسلۂ یعنی چینی، دودھ اور
کوہاٹ کے پانی کی وساطت سے ایوب صابر کو دل میں بٹھاتا ہوں۔ اور
اپنی رگوں میں بہتے ہوئے لہو میں سمو کر محفوظ کر لیتا ہوں۔

چائے ختم ہوتی ہے۔ تو یہ شخص میری انگلی پکڑ کر چھاؤنی کے دروازے
سے مین بازار میں داخل ہوتا ہے۔ اور ہر راہی سے، ہر دکاندار سے
کہتا ہے۔

"یہ ہے رحیم گل۔ یہ ہے رحیم گل۔!"

میں سوچتا ہوں — یہ جنگلی خیلی میرے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔
ابھی کوئی ہاتھ اٹھائیگا۔ ابھی کوئی چاقو لہرائے گا۔ اور کہے گا۔

"اچھا، وہ تم ہو جس نے عجیب خان کے بھائی پر گولی چلائی تھی -!"

مگر ایسا نہیں ہوا ۔ لوگوں نے میری طرف دیکھا ۔ اُن کی آنکھوں میں فخر و انبساط کی چمک تھی ۔ ان کے ہاتھوں میں محبّت کی گرمی تھی ۔ اور ان کے رویوں میں والہانہ بے ساختگی تھی ۔

میں نے چونک کر اس جنگل خیلی کی طرف دیکھا، لیکن اس دن میرے سینے میں یہ احساس نہیں تھا ۔ کہ میں نے اس سادہ دل پٹھان کو ٹھگ لیا ہے ۔ بلکہ میں اس کے رویّے سے مرعوب ہو گیا تھا ۔

سچائی کو پہچاننے میں انسان بہت کم غلطی کرتا ہے ۔

یہ وہی دن تھا ۔ کہ مجھے ایوب صابر کے ذریعے کوہاٹ کے ایک مہذب اور شریف آدمی کے نیاز اور دوستی کا شرف حاصل ہوا تھا ۔ یہ ہفت روزہ "ہمدم" کے مدیر جناب اختر مرحوم تھے ۔ قہوے کا وہ ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے ۔ جو اختر مرحوم کی محبت کی طرح لذت آفریں تھا ۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا ۔ مجھ پر ایوب صابر کی فعال شخصیت کے پرت کھلتے چلے گئے ۔ وہ پشتو زبان کا شاعر ہے ۔ اور پشتو کا نثار بھی ہے ۔ وہ اردو زبان کا شاعر ہے اور اردو کا بہترین نثار بھی ہے جن لوگوں نے دونوں زبانوں میں ان کا مطالعہ کیا ہے ۔ ان کو اندازہ

ہو گا۔ کہ ان کے خیالات و افکار میں کس قدر پختگی ہے۔ اور دونوں زبانوں کے اظہار پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

"تنقید اور تبصرے میں بھی ان کو عمل دخل ہے۔ اور بجا طور پر ہے۔ ان کا نقطۂ نظر بہت واضح ہوتا ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔ اگر وہ افسانہ بھی لکھتے تو میں انہیں سرحد کا احمد ندیم قاسمی کہتا — !

یہ اس لئے کہ ایوب صابر، ندیم صاحب کی طرح اخبار نویس بھی ہیں۔ شاعر بھی اور ادیب بھی، دونوں قلم کی روزی کھاتے ہیں۔ دونوں روزانہ پڑھتے ہیں۔ اور روزانہ کاٹتے ہیں۔ دونوں صبر آزما معاشی بحرانوں سے گزرے ہیں۔ دونوں ایک طویل جد و جہد کی علامت ہیں۔ دونوں محب وطن ہیں۔ دونوں شریف آدمی ہیں۔ مگر دونوں کا چال چلن پولیس کی نگاہ میں مشکوک رہا ہے — اس کے باوجود دونوں خوش قسمت ہیں۔ کہ ابھی تک بھینس چوری کی تعزیر سے بچے ہوئے ہیں — !

دونوں میں اگر فرق ہے۔ تو ندیمیت کا، اور ایوبیت کا، ندیم صاحب کے ادب میں نرم روی ہے۔ اور ایوب کے ادب میں آتش نوائی۔ ایک میں گداز ہے۔ دوسرے میں حرارت —،

ایوبیت کے ذکر سے یہ نہ سمجھئے کہ میں حضرت ایوبؑ کے صبر اور برداشت کی نفی کر رہا ہوں۔ اور اس لفظ کو نئے معنی دے رہا ہوں —

پچھلے دنوں ایوب صابر کی ایک کتاب چھپی۔ جس میں پشتو ادب کے گذشتہ چند سالوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس پر ایک صاحب نے کہا تھا۔

"کتاب بہت اچھی ہے۔ مگر اس میں ایوبیت نہیں ہے۔!"

میں نے پوچھا "اس کے کیا معنی۔؟"

جواب ملا "ایوب صابر کے لہجے میں جو جارحیت ہوتی ہے۔ وہ اس کتاب میں نہیں ہے۔!"

اگر انہوں نے میانہ روی اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔؟"

شخص مذکور نے کہا "نہیں صاحب نہیں۔ شیر اگر جنا چھوڑ دے شکار پر جھپٹنے کی خو بو نہ رہے۔ اور گوشت کی بجائے گھاس کھانے پر راضی ہو جائے۔ تو اسے شیر کون کہے گا۔!

یہ بات دل کو لگی۔ اور مجھے ڈی ایچ لارنس کا وہ قول یاد آ گیا۔ کہ جسم میں دوڑنے والے لہو کا سچ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔ اور کسی کی فطرت کو کچل دینا سب سے بڑا ظلم ہے۔

گویا ان کی تحریر کی حرارت ہی اصل چیز ہے۔ وہ آتش زیر پا ہو کر جو کچھ لکھتے ہیں۔ وہ ان کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اور وہی آمد بھی ہے۔ بیچ کا راستہ ان کا مقدر نہیں ہے۔ ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ کوئی

فطری فنکار بیچ کا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ اختیار کرے گا۔ تو وہ شعوری کوشش ہو گی۔ شعوری کوشش سے بڑا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا ۔۔

بڑا ادب وہی لوگ تخلیق کرتے ہیں۔ جو معاشرتی، تہذیبی اور مذہبی دباؤ سے آزاد ہوتے ہیں۔ جن میں سچ بولنے کی ہمت ہوتی ہے۔ اور جو اپنی فطرت کی خرابیوں اور خامیوں کا برملا اظہار کر سکتے ہوں ۔۔۔ رزق کا خوف ہو۔ تو پھر سچ سوچا جاتا ہے۔ سچ سوچا جائے۔ پھر کتابیں تو لکھی جا سکتی ہیں۔ ادب پارے تخلیق نہیں ہوں گے۔

ایوب صابر کی فطرت میں بھی وہی کچھ ہے جو فطری فنکاروں کا منفرد ہے ۔۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ سچی بات کہتا ہے۔ نقصان اٹھاتا ہے ۔۔۔ وہ اپنے جسم میں دوڑنے والے خون کی سچائی سے انکار نہیں کرتا ۔۔۔ وہ اگر کوشش کرے۔ اور سمجھوتے کی طرف قدم اٹھائے۔ تو یہ کوشش زیادہ سے زیادہ چند دن یا چند مہینے تک زندہ رہے گی۔ اور وہ دنیا دار بن جائے گا۔ مگر نا ممکن ہے۔ کہ وہ اسے طول دے سکے یہ اس کی نیچر کا تقاضا ہے۔ کہ سچ بولے اور وہ بولتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے۔ اور میں اس کی اسی فطرت سے پیار کرتا ہوں۔

فطری فنکاروں کا یہ کچھ جسے آپ ٹیڑھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عجیب

دغریب چینہ ہے۔ یہ ٹیڑھ غیر ارادی طور پر دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ اور دوستوں کی تعداد میں کمی، بلکہ بہت قریبی رشتہ دار بھی فنکار کی اس ٹیڑھ سے نالاں رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ٹیڑھ دراصل فنکار کی ذہانت اور فراست ہوتی ہے۔ اس فراست میں وہ گہرا احساس ہوتا ہے۔ جو اُسے ہمیشہ سچ کہنے پر اکساتا ہے، اور سچ وہ چیز ہے۔ کہ انکو تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں!

چونکہ دوسرے لوگ ان جیسا ذہن نہیں رکھتے۔ وہ سچائی کی جگہ مصلحتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فنکار ہمیشہ جھنجھلاہٹ کا شکار رہتا ہے۔ اور سماج سے کٹ جاتا ہے۔

جھنجھلاہٹ پر یاد آیا۔ کہ میکسم اور ایوب صابر کی طرح قتیل اور ایوب کی شکر رنجیاں بھی اسی جھنجھلاہٹ کی پیداوار ہیں۔ ہم لوگ آپس میں بھی دست و گریباں رہتے ہیں۔ کہ یہاں سچائیاں، سچائیوں سے ٹکراتی ہیں۔

ایک کہتا ہے — میرا سچ بڑا ہے۔"

دوسرا کہتا ہے — "میرا سچ عظیم ہے۔"

یہاں میں سیاسی سچائیوں کا ذکر نہیں کرتا، مثلاً بدھ ازم، ہندو ازم، عیسائی ازم، یا اسلام ازم، اشتراکی ازم، یا امریکی ازم، یا یوں کہ مشرق کی سچائیاں مغرب کی سچائیاں۔ میرا مطلب فنکارانہ سچائی سے ہے۔ ہم ہمیشہ اسی

سچائی کے لئے برسرِپیکار رہتے ہیں ۔

اس کا فیصلہ ہم دوسروں پر نہیں چھوڑتے۔ اور نہ آنے والی نسل کا انتظار کرتے ہیں۔ بلکہ قصۂ زمین بر زمین! کہ یہی ہماری انّا کا تقاضا ہوتا ہے ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انا کی جنگ، فوجوں کی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے کہتے ہیں۔ آدمی مرجائے۔ کچھ نہیں مرتا۔ لیکن انا مرجائے تو سب کچھ مرجاتا ہے۔!

اس انا کی جنگ میں ادیب اور قتیل بھی برسرِپیکار رہے ہیں۔ لیکن آپ یہ توقع نہ رکھئے کہ میں دونوں کی چھوٹی چھوٹی معصوم لڑائیوں سے پردہ بھی اٹھالوں گا، کیونکہ میرے رسولؐ کا حکم ہے۔ کہ پردہ پوشی بہر حال افضل ہے۔

مگر اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ آپ کو بتاسکوں۔ کہ جب کڑا وقت آتا ہے۔ تو دوست، دوستوں کو کس طرح پہچانتے ہیں۔ اور میان سے نکلی ہوئی تلواریں پلک جھپکتے میں اپنی سمت کس طرح تبدیل کرتی ہیں ۔ ؟

بہت پچھلے دنوں کا ذکر ہے ۔ گلڈ کے سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔

یہ بڑا باوقار اور ذمہ دار عہدہ تھا۔ منفلب بلے کے لئے ادبی حلقوں

کے تین مستند ہاتھیوں نے سونڈ اٹھا کر بزم آرائی کا اعلان کیا۔

بڑی واہ واہ ہوئی۔ تالی بجی۔ کون جیتے کون ہارے۔ اس سے غرض نہ تھی۔ تمنّا تو صرف اتنی تھی۔ کہ فرہاد پہ سنگ باری کا تماشہ دیکھیں گے۔!

ان تینوں ہاتھیوں سے ہماری سلام دعا تھی۔ مگر ان میں سے ایک ہاتھی ایسا بھی تھا جس سے ہماری صرف سلام دعا ہی نہ تھی۔ بلکہ اتنی قربت تھی کہ جب جی چاہا۔ اس کی پیٹھ پر ہودج رکھی۔ اور جہاں سینگ سمایا نکل گئے۔

یہی وقت تھا کہ علاوہ حلالی کا ثبوت پیش کرتے اور کہتے۔

"قتیل! بتا ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں ؟"

قتیل ہنس پڑا۔ اور بولا "تم کو ہاٹی ہو۔ !

میں نے کہا۔" ایوب صابر سے پوچھ لو۔"

قتیل نے کہا۔" وہ تمہاری مخالفت کرتا ہے۔ تمہارے کہنے سے مجھے کب ووٹ دے گا۔ ؟"

میں نے کہا۔" مخالفت تو وہ تمہاری بھی کرتا ہے۔ تم بھی اس کی مخالفت کرتے ہو۔ مگر ووٹ وہ تم ہی کو دے گا۔"

کہنے لگا۔" کیونکر۔ ؟"

میں نے کہا۔" وہ انا کی جنگ ہے۔ یہ برادری کی جنگ ہے۔ انا کی جنگ میں وہ تمہارا مقابلہ کرے گا۔ اور برادری کی جنگ میں تمہارا ساتھ دے گا۔"

یہ بات قتیل کی سمجھ میں آگئی۔

اور جب امتحان کا لمحہ آیا۔ تو ایوب صابر سب سے پیش پیش تھا۔ وہ قتیل کے لئے اس طرح لڑ رہا تھا۔ گویا یہ خود اس کے بقا کی جنگ ہو۔!

قتیل خود حیران تھا۔ کہ یہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔؟

تب میں نے اسے بتایا۔" یہ کوہاٹ کی مٹی ہے۔ کہ دامن کو لگ جائے۔ تو دھوبی بھی اس کی خوشبو نہیں اتار سکتا۔!"

میں نے کہا۔" یہ وہ مٹی ہے جس نے احمد فراز کو جنم دیا۔ یہ وہ مٹی ہے جس نے رستم کیانی کو جنم دیا۔"

میں نے کہا۔" یہ وہ مٹی ہے جس کی خوشبو ہمیں بار بار یہاں لاتی ہے۔ کبھی رحیم گل کے بہانے۔ کبھی ایوب صابر کے بہانے۔!"



جھونگا

پنجاب میں رواج ہے۔ عورتیں گھروں سے سودے کے لئے نکلتی ہیں، تو عام طور پر ایک آدھ بچہ بھی ساتھ ہوتا ہے۔ آپ اسے باڈی گارڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔

چالاک دکاندار جب سودا بیچ ڈالتے ہیں اور پیسے وصول کر لیتے ہیں۔ تو گاہک کو مستقل گاہک بنانے کیلئے ایک نفسیاتی داؤں کھیلتے ہیں عورت کے ساتھ جو بچہ ہوتا ہے۔ دکاندار اُسے چار چھ آنے کی چیز مفت پکڑا دیتا ہے۔ بچہ خوش ہوتا ہے۔ بچے کی ماں بھی خوش ہوتی ہے۔ بچہ گھر آ کر تالی بجاتا ہے۔ گھر کے دوسرے افراد کو متوجہ کرتا ہے۔

"یہ دیکھو میرا جھونگا' یہ دیکھو میرا جھونگا!"

یوں دکاندار اور گاہک میں ایک نازک سا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اس خیر بانی وار سے دکاندار ہی فائدہ میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جس بچے کو روز جھونگا ملے۔ اس بچے کی ماں کسی اور دکاندار کے پاس کیوں جانے لگی۔

میرا اور ایوب صابر کا بھی کچھ ایسا ہی رشتہ ہے کبھی یہ دکاندار ہوتا ہے۔ اور میں گاہک۔ اور کبھی میں دکاندار ہوتا ہوں۔ اور وہ گاہک، پرسوں آیا۔ ملاقات ہوئی۔ انھوں نے محترم عزیز اختر وارثی کے ساتھ تقریب کا ذکر کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ میں نہ صرف اس تقریب میں شامل ہوں۔ بلکہ حق مکالمہ بھی ادا کروں۔

عرض کیا " آداب تقریر نہیں جانتا، دیہاتی آدمی ہوں۔ مائیک پر آ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔!"

حکم ہوا " دو چار سطریں ہی لکھ ڈالو۔"

عرض کیا " نو نقد نہ تیرہ ادھار" گویا میں جھونگے میں پڑھوں گا۔"

کہنے لگے " دوستوں میں حساب نہیں ہوتا۔"

عرض کیا " معاملہ جھونگے کا ہے۔ وارثی صاحب بچے تو نہیں۔ کہ جھونگا قبول کریں۔"

کہنے لگے " ارے یار سارے ادیب بچے ہوتے ہیں۔ فارغ کو

نہیں دیکھا۔ کتنا پیارا بالغ بچّہ ہے۔ صبح ناراض ہو جاتا ہے شام کو گلے لگا کر چومتا ہے۔ تمہیں عزیز اختر وارثی کو سٹڈی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بڑا گاڈ دی بچّہ ہے۔!"

تو دوستو۔ یوں ایوب صابر کے ہھتے چڑھ گیا۔ مگر اتنے شارٹ نوٹس پر مضمون کیسے لکھ سکتا تھا۔ اس لئے آپ سب کو بمع جناب عزیز اختر وارثی کے میرا یہ جھونگا قبول کرنا پڑے گا۔

حالانکہ جس شخص کو پندرہ بیس برس سے جانتا ہوں۔ اس کو جھونگے پر ٹرخانا زیب نہیں دیتا۔ اگر ارباب علم و فن مجھے وقت پہ اطلاع دیتے تو میں جناب عزیز اختر وارثی کی میٹھی میٹھی اور نرم و گداز شخصیّت پر اچھا خاصا مضمون لکھ سکتا تھا۔

اور یہ بھی، کہ اگر اس گرم موسم میں کسی نجی کام کیلئے لاہور سے کوہاٹ آ سکتا تھا۔ تو وارثی صاحب کو ہدیہ عقیدت پیش کرنا میرے لئے بہت بڑی ذمہ داری کی بات تھی۔ ایسی خوشگوار ذمہ داری، جس کی تکمیل سے قلب و جگر کو طمانیّت پہنچتی ہو۔ اور اس سے عہدہ برآ ہونا یقیناً سعادت کا باعث بنتی ہو۔

اور پھر اس طرح کی تقاریب کا ایک دوسرا پہلو بھی تو ہوتا ہے۔ کہ ہم احساس کے مارے ہوئے لوگ زندگی بھر خون جلاتے ہیں۔

تو دولت کی ہوس میں نہیں جلاتے۔ شعر و ادب سے اس سماج میں کب کسی نے محل کھڑے کئے ہیں۔ ہم فنکار لوگ تو دو میٹھے بولوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اہلِ فن کا اعتراف ہی ہماری روحانی غذا ہوتی ہے۔

چنانچہ یہ روایت اچھی چلی ہے۔ کہ جیتے جی اہلِ ہنر کو اُس کی خدمات اور مقام کا احساس دیا جائے۔

یوں زندگی آگے بڑھتی ہے صرف بڑھتی ہی نہیں۔ زندگی حسین ہو جاتی ہے۔

جب آپ فیض اور ندیم، اور وارثی کو ساٹھے پاٹھے کے روایتی طعنے کے بجائے اُن کی عظمتوں کا پرچم لہراتے ہیں۔ تو یہ ساٹھے پاٹھے ایک بار پھر سے جوانِ رعنا کی سی توانائیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اور نئے دم خم سے میدانِ ادب میں چوگان کھیلتے ہوئے گوئے سبقت کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر آپ آذر سے بھی یہی سلوک کرتے۔ تو وہ اتنی جلدی نہ مرتے۔

آج آپ مجید امجد مرحوم کو اقبال کے بعد سب سے بڑا نظم گو شاعر کہتے ہیں۔ مگر اس مردِ درویش کی زندگی میں اس کا اعتراف نہ کر سکے۔

بعد از خرابیٔ بسیار سہی۔ آپنے آخر زندوں کا حق تسلیم کر لیا ہے میں اس پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اور آپ سے کہتا ہوں۔ کہ یہ جو ہوا چلی ہے۔ نہایت خوشگوار ہے در و دریچے وا رکھیئے۔ تا کہ مسام جاں کو تازہ جھونکے پہنچتے رہیں۔ میرا خیال ہے۔ اب مجھے دامن سمیٹ لینا چاہیئے۔ ورنہ یہ جھونکا کہیں مضمون نہ بن جائے۔

میں ایک بار پھر ارباب علم و فن اور خصوصًا ایوب صابر کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ یہاں تک پذیرائی ہوئی۔ اور آپ سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔



سقراط و بقراط

کہتے ہیں جس طرح سقراط سچائی کی علامت ہے۔ اسی طرح بقراط دانش و آگہی کی حدیث! سقراط سے میری بہت پرانی راہ و رسم ہے۔ نامہ و پیام میں بھی یہ شخص کھرا، ستھرا اور بے ریا' دنیا داری' رواداری اور وضع داری میں بھی یکتا' میں نے جب بھی راوی کے اس پار سے پکارا، تو اٹک کے اس پار سے اس شخص کی محبت بھری آواز سنائی دی۔

یہ شخص تاج سعید تھا۔ جسے آج کی محفل میں سقراط کہنے کو جی چاہ رہا ہے۔

تو دوستو ـــــ سقراط نے ایک بار مجھے خط لکھا۔

بھائی رحیم گل' تم نے چار دو کے بعد اب پشتو میں بھی فلمیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ تو تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے۔ کہ میری بیوی زیتون بانو

پشتو کی نہ صرف معروف افسانہ نگار ہے۔ بلکہ مشہور شاعرہ بھی ہے لہٰذا اگر تم کہانی اور مکالمے کا بار خود اٹھانے ہو تو اٹھائے رکھو۔ مگر جان لو۔کہ تم شاعر نہیں ہو۔کہ ہر جگہ ٹانگ اڑاؤ — لہٰذا اب تم جو بھی فلم بناؤ گے۔ تو گانوں کی سیچوایشن لکھ کر بھیج دو۔ تاکہ بانو اس پر طبع آزمائی کرے۔

میں نے سوچا۔ سقراط ٹھیک کہتا ہے۔ چونکہ سرحد کو چھوڑے ہوئے بیس بائیس برس گزر گئے تھے۔ اور میں پشتو ادب کی رفتار اور مزاج سے ایک حد تک دور چلا گیا تھا۔ لہٰذا میں نے خواہ مخواہ کی مخبری جتلانے کیلئے ایک صاحب سے پوچھا۔

"بانو کیسی شاعرہ ہیں — ؟"

شخص مذکور جس کا نام اس لئے نہیں بتاؤں گا۔کہ نقصِ امن کا اندیشہ ہے۔ بہر حال اس شخص نے کہا — "بہت بقراط قسم کی عورت ہے!"

اگرچہ یہ فقرہ اپنے لغوی معنوں میں کچھ اتنا زیادہ سخت نہیں تھا۔ لیکن جس لہجے میں یہ فقرہ ادا کیا گیا تھا۔ اس سے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ مگر مجھے تو بہر حال سقراط کا کہا ماننا تھا —

میں نے سچ اشتنر لکھ کر بھیج دیں۔ بانو نے گانے لکھے۔ اور سچ بتاؤں۔ خوب لکھے۔ یہ میرا ان سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

"قتیل کی فلم عجب خان آفریدی کی ریلیز کے سلسلے میں پشاور جانا ہوا۔ ایک دن ریڈیو اسٹیشن گئے۔ تاج سعید کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ سفید کوٹ اور سفید سوٹ میں ملبوس ایک ہنستی مسکراتی خاتون اندر آگئیں۔ سقراط نے تعارف کرایا۔

"قتیل صاحب، رحیم گل صاحب، اور یہ میری بیوی بانو ہے!"

بانو نے ہم دونوں کو آداب کیا۔ میں حیرت و استعجاب سے سرخ و سپید، سراپا تبسم بانو کو دیکھ کر رہا تھا۔ اور پریشان ہو رہا تھا۔ کہ اچھا ایسے ہوتے ہیں بقراط!

ان دنوں سقراط بقراط دونوں ریڈیو میں ملازم تھے۔ بقراط کا عہدہ سقراط سے ذرا بڑا تھا۔ یہ تو خدا ہی جانے یا سقراط جانے۔ کہ جب بیوی حاکم ہو اور شوہر محکوم، تو مجازی خدا کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اور وہ زندگی کو کس طرح برتتا ہے۔؟ لیکن خدا بانو کا بھلا کرے انھوں نے دوران ملازمت ایم اے کر لیا۔ اور ریڈیو چھوڑ کر درس و تدریس کے پیشے میں چلی گئیں۔ اور یوں دفتری اوقات میں انھوں نے کو قلو پطرہ کی حاکمیت سے نجات ملی۔

برسبیل تذکرہ، بانو کا ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے میں بابر کا بھی
بہت ہاتھ تھا۔ بابر ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ اور سب کو بہت
پیارا ہے۔ حالانکہ سقراط بقراط کے سارے بچے بہت پیارے ہیں۔ ماں
کی ناک اور ماں جیسے دہانے والے بچوں نے مزاج اپنے باپ کا پایا ہے
اس لیے سونے پر سہاگہ ہو گیا ہے۔ وہ جو برنارڈ شا کو کسی ایکٹریس نے
کہا تھا — "آؤ ہم تم شادی کر لیں: تاکہ جو اولاد پیدا ہو، وہ آپ کا
دماغ اور میری شکل لیکر آئے —"
برنارڈ شا نے جواب دیا تھا — "اس کی کیا ضمانت؟ کہ جو اولاد
پیدا ہو گی۔ اس کی شکل مجھ جیسی اور دماغ تم جیسا نہ ہو گا —؟"
تو دوستو — اگر برنارڈ شا زندہ ہوتا۔ تو ہم اس سے کہتے — "
دوست۔ تم سے غلطی ہوئی۔ خواہ مخواہ کے مغالطے میں ایک
خوبصورت عورت سے ہاتھ دھو بیٹھے" — یہ دیکھو۔ یہ زندہ
مثال، شکلیں ماں پر، مزاج باپ کا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی بابر کی — بابر ان دنوں دو ڈھائی سال
کا تھا — یہ لوگ صبح صبح اٹھ کر تیار ہوتے۔ جلد جلد ناشتہ کرتے
بچوں کو تیار کر کے سکول بھیجتے۔ اور خود اپنی ڈیوٹیوں پر
پہنچتے۔ تو ننھا معصوم بابر پوچھتا — "ماں، آج مجھے کس کے گھر

چھوڑ کر جاؤ گے ؟"

تو ماں کا کلیجہ کٹ کٹ جاتا ۔ کیونکہ یہ روز کا معمول تھا ۔ بابر روزانہ اپنی توتلی زبان سے دل ہلا دینے والے فقرے تخلیق کرتا ۔ اور ماں باپ کو احساس کراتا ۔ کہ تم دونوں زندہ ہو ۔ مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہو ۔ پھر بھی روزانہ چھ سات گھنٹے کی یتیمی میرے لئے مقدر ہو گئی ہے ۔ کہ میں سہما سہما در و دیوار کو دیکھتا ہوں ۔ اور ہمسایوں کے ان بچوں کو بھی جنہیں ان کی مائیں اپنی گداز سینوں کی حرارت پہنچاتی ہیں ۔۔۔

غالباً یہ بابر ہی تھا جس نے بانو سے ریڈیو کی نوکری چھڑوائی ۔ چار چھ ماہ بعد دوبارہ پشاور جانا ہوا ۔ سقراط اور بقراط سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں ۔ اور میں نے بانو کا افسانوی مجموعہ مات ننگرٹی پڑھا ۔ تو فوراً ترغیب ہوئی ۔ کہ اتنے خوبصورت افسانوں سے پاکستان کے دوسرے لوگ کیوں محروم رہیں ۔ لہٰذا میں نے ترجمے کی ہامی بھری اور بانو کے چھ سات افسانے اپنے ساتھ لے آیا ۔ سب سے پہلے مات ننگرٹی کا ترجمہ " ٹوٹی ہوئی چوڑیاں " کے عنوان سے کیا ۔ یہ افسانہ حکایت میں شائع ہوا ۔ اور پھر کٹی پر چول نے اسے دوبارہ چھاپا ۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی یہ افسانہ " کانچ کے ٹکڑے " کے عنوان سے

موجود ہے۔ لیکن اس میں وہ "تاثر" نہیں۔ جو میرے ترجمے میں موجود تھا۔ خدا جانے۔ اس بیانیہ لہجے کے ترجمے کو میرے افسانوی انداز پہ کیوں ترجیح دی گئی ؟

بانو کے دوسرے افسانوں کے ترجمے بھی ہوتے رہے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ یوں بانو پاکستان کے اردو دان طبقہ میں اچھی خاصی متعارف ہو گئیں۔ اس سلسلے کا ایک لطیفہ یا خفیفہ بھی سن لیجئے ــــ محترمہ عذرا اصغر پرچہ نکالنا چاہتی تھیں۔ ان کا خط آیا ــ پرچے کے لئے افسانہ مانگ رہی تھیں میرے پاس اپنا کوئی افسانہ تیار نہ تھا۔ بانو کا ایک افسانہ ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ محترمہ کا جوابی خط آیا۔ افسانے کے نفس مضمون کے علاوہ میرے ترجمے کی تعریف کی تھی۔ اور یہ کہ "ترجمہ نہیں" بلکہ بالکل اوریجنل لگتا ہے۔ ساتھ ہی تاکید کی تھی۔ کہ میں اپنا افسانہ بھی لکھ کر بھیجوں۔

کچھ عرصہ بعد تاج اور بانو "قند" کی کسی تقریب کے سلسلے میں لاہور آئے۔ جب میں نیشنل سنٹر پہنچا۔ تو عذرا اور بانو ایک کونے میں کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ مجھے دیکھا۔ تو اشارے سے بلایا۔ بانو بہت خوش تھی۔ ہنستے ہوئے بولی ــ " عذرا

کہہ رہی ہے ۔میں نے رحیم گل کو بانو کے افسانوں کی وجہ سے جانا ہے!"
بے چاری عذرا کا برا حال تھا۔ وہ شاید صفائی پیش کرنا چاہتی تھی۔
لیکن اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے کہہ دیا ۔۔۔" اس طرح کی بات عذرا نے
لوگوں سے بھی کہی ہے۔ کہ رحیم گل کی وجہ سے بانو اردو ادب میں متعارف
ہو گئی ہیں!"

اب دونوں کا برا حال تھا اور میں ہنس رہا تھا مگر کمال ہے۔ تینوں انا
کے مارے ہوئے ہیں سے کسی نے بھی برا نہ مانا ۔ اور دوسرے دن صاف
ذہن کے ساتھ عذرا اصغر کی دعوت میں شریک ہوئے۔

ایک بات میں کہنا بھول گیا۔۔ کہ بانو شاعر ہے۔ اور تاج بھی شاعر
ہے۔ دونوں ادیب ہیں ۔ ایک اردو کا، دوسرا پشتو کا، تاج خالص پشاوری
ہے۔ اور بانو خالص پٹھان ایک کی مادری زبان پشتو، شادی کو اتنے
سال گزر گئے۔ مگر جس طرح "تاج" بانو کا اردو لہجہ درست نہ کر
سکا۔ اسی طرح بانو "تاج" کا پٹھانی لہجہ درست نہ کر سکی ۔۔ یہ بالکل
اس طرح، جیسے خاطر غزنوی، فارغ بخاری اور تاج سعید سرحدی ہونے
کے باوجود پشتو بولتے ہیں۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ گویا جھوٹ بول
رہے ہوں۔ اور خود میں، جیسے آپ اردو کا ادیب کہتے ہیں۔ جب
اردو بولتا ہوں تو احباب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

اور طنز یہ انداز میں مسکراتے ہیں۔ کہ اچھا، تو یہ ہے "تن تارارا" کا مصنّف مگر یہ ہمارے مسائل ہیں۔ اگلی نسل کے مسائل نہیں، ان کے بچے فسٹ کلاس پشتو بولتے ہیں۔ فسٹ کلاس اردو بولتے ہیں۔ اور ہندکو تو خیر گھر کی لونڈی ہے — تو نتیجہ یہ نکلا۔ کہ بین الاضلاعی شادیاں بہت ضروری ہیں۔ ہندکو اور پشتو کا یہ اتصال بعید نتیجہ خیز نکلا ہے۔ لیکن ایک بات محسوس ہوتی ہے۔ کہ چونکہ ہندکو کا لہجہ دھیما اور میٹھا ہے۔ پشتو نسبتاً کھردری اور اکھڑ زبان ہے — غالباً یہی وجہ ہے۔ کہ زبانوں کی فطرت اپنا اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اور سقراط بقراط کے سامنے سہما سہما سا رہتا ہے۔

جب وہ بانو کی ڈانٹ ہنستے مسکراتے اور چمکتے دانتوں سے سنتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں۔ یہ کوئی بزدلی یا برائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک پہلو سے یہ ضروری ہے کہ گھر میں عورت کی کمانڈ ہو۔ اس طرح ننانوے فیصد فساد خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

بے چاری بانو ایم اے کرنے کے باوجود چار پانچ بچوں کی ماں کا مقدس درجہ رکھتی ہے۔ ملازمت کرتی ہے۔ گھر کو صاف ستھرا رکھتی ہے۔ سارے گھر کو ناشتہ اور دو وقت کی روٹی پکا کر دیتی ہے

اور اس پر طرّہ یہ کہ افسانے بھی لکھتی ہے۔ یعنی دو طرح کی تخلیق، خوبصورت افسانوں اور خوبصورت بچوں کی تخلیق — مگر اس کے بدلے مانگتی کیا ہے۔ گھر کی چابیاں، اور قدرے بلند آہنگی کا مظاہرہ۔

تو کیا حرج ہے اس میں، — میں اصغر مہدی صاحب اور سقراط سے کہوں گا۔ کہ اگر خوش قسمتی سے آپ کی بیویاں افسانہ نگار ہیں۔ اور روپے کے ساتھ نام بھی کماتی ہیں۔ گھر کا نظام بھی چلاتی ہیں۔ تو آپ سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو گا — ایک ہماری بیوی ہے۔ کہ لکھنے کا موڈ بنتا ہے تو کروٹ بدل کر کہتی ہے —

"اب تو سو جائیں۔ اب تو بتی بجھا دیں آپ!"

میرا خیال ہے۔ آپ دونوں ایسے گئے گزرے نہیں۔ کہ تخلیقی لمحوں کے کرب کا احساس نہ کریں اور بیویوں سے کہیں —" جانِ من اب تو سو جائیں اب تو بتی بجھا دیں آپ!"

محترم اصغر مہدی کا ذکر آ گیا ہے۔ جی چاہتا ہے آج کی محفل میں اصغر مہدی کو بھی سقراط کا خطاب دے دوں۔ لیکن ادھر عذرا کو بقراط کہنے سے ڈر بھی لگتا ہے!

اب بیویوں کا ذکر آ گیا ہے۔ تو لگے ہاتھوں اپنی بیوی کا قصّہ بھی سن لیجئے۔ چودہ پندرہ برس پہلے میری شادی ہوئی۔ اپنی نئی نویلی

دلہن سے کہا۔

"چل مٹیارے، تینوں اپنے دیس دے چپلی کباب کھلاواں!"

بولی ــ "نا بابا نا، مجھے پٹھانوں سے ڈر لگتا ہے اور وہ چپلی کباب تو ہرگز نہیں کھاؤں گی!"

اگر محبت کا چکر نہ ہوتا۔ کیونکہ نو ناکام محبتوں کے بعد یہ دسویں کامیاب محبت تھی۔ تو ایسا جواب سن کر آپے سے باہر ہونا بہت ضروری تھا۔ مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ ایک دن آئے گا جب تجھے کیا بول کے ذائقے کی ایسی مار دوں گا۔ کہ تڑپ تڑپ کر کہو گی ــ "ایک بار کھایا ہے۔ دوسری بار کھانے کی ہوس ہے!"

اور وہی ہوا ــ ایک بار دھوکے سے گرم گرم چپل کباب کھلائے تو کوہ ندا سے فوراً آواز آئی ــ "ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے!"

مگر میں بھی پٹھان۔ دس برس تڑپائے رکھا۔ جب بالکل ہار گئی۔ تو اس پر ترس آگیا۔ آخر وہ میرے بچوں کی ماں تھی۔ چنانچہ سقراط کو خط لکھا کہ ہم پشاور آرہے ہیں۔ میری بیوی جلیل کی دکان کے کباب کھانا چاہتی ہے۔ سقراط نے کہا۔

بسر و چشم، بہ دل و جان، چشم ما روشن دل ما شاد،

بانو سے میری بیوی کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ دونوں گلے ملیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔

جب وہ دونوں میاں بیوی ہماری خاطر و مدارات کا بجٹ تیار کرنے دوسرے کمرے میں گئے۔ تو میری بیوی کی رگ تنقید پھڑک اٹھی۔ جیسے کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ بولی ۔" ویسے تو بانو اچھی ہے۔ مگر بالوں کا سٹائل اچھا نہیں!"

میں نے کہا ۔" ممکن ہے۔ بانو کو تمہارے بالوں کا سٹائل پسند نہ ہو ۔ ؟

بولی ۔" آپ کو کونسا سٹائل پسند ہے ۔ ؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔" مجھے تو تمہارے سادہ بال اچھے لگتے ہیں "

اتنے میں بانو آگئی ۔ بولی ۔" گل صاحب، ویسے تو آپ کی بیوی اچھی ہے۔ آپ کے لائق ہے مگر ایک بات بتاؤں ۔ آپ دونوں بہن بھائی لگتے ہیں!"

شام کو بانو سکول سے واپس آئی۔ تو بہت خوش تھی۔ کہنے لگی ۔" آج میں نے دوسری ٹیچرز کے سامنے بہت ڈینگیں ماری ہیں کہ "تن تارا را" کا مصنف ہمارا مہمان ہے۔ سب آپ سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا۔ کہ بیوی بچوں سمیت آیا ہے۔ تو

معاملہ بگڑ گیا

اور پھر وہ بے ساختہ قہقہے مارنے لگی۔

شام کے کھانے میں بھی بانو نے بہت اہتمام کیا تھا۔ لیکن مرغ بوڑھا تھا۔ اور شدید زور آزمائی کے باوجود ہماری دال نہ گل سکی۔ لیکن بھلا ہو سقراط کا۔ وہ ڈیڑھ دو سیر چپل کباب جلیل کی دکان سے اٹھا لایا تھا اور ہم ندیدوں کی طرح اس پہ پل پڑے تھے۔ اور پھر ایسے سوئے کہ آنکھ کھلی۔ تو لاہور میں تھے۔







لاہور کے تین ادبی فتنے

اس سے پہلے کہ میں فتنوں کا ذکر کروں۔ آپ کو بتاتا چلوں۔ کہ فتنے کے معنی میرے نزدیک وہ نہیں ہیں۔ جو آپ نے کتابوں میں پڑھے ہیں۔ اگر فتنہ انگیزی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ ماحول میں ایک حرکت اور ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے ـــ ایسی ہلچل، کہ نئی نئی راہیں سوجھتی ہیں ـ نئے نئے افق نظر آنے لگتے ہیں۔ تو اسے فتنہ انگیزی نہیں، زندگی کی علامت سمجھنا چاہیئے میرے سارے فتنے ایسی ہی صفات سے متصف ہیں۔

یہ فتنے کسی کا گریبان پھاڑتے ہیں۔ تو بہت مزہ آتا ہے۔ کیوں کہ جس کا گریبان پھٹتا ہے۔ تو سفید کالر کے نیچے سے اس کی میلی بنیان نظر آجاتی ہے اور یوں پہچان میں آسانی ہو جاتی ہے۔

یہ فتنے کسی کی پگڑی اچھالتے ہیں۔ تو بہت لطف آتا ہے۔ کیونکہ اس طرح یہ راز کھل جاتا ہے۔ کہ دستارِ فضیلت تو محض گنج چھپانے کیلئے سر پہ رکھی تھی۔

یہ فتنے کسی کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو نوٹ کی بجائے رومال نکال کر لوگوں کو سونگھاتے ہیں جس میں بلغم، بوٹ پالش۔ اور کچے گوشت کی ملی جلی بدبو ہوتی ہے — یوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کے محاورے کی صداقت سامنے آجاتی ہے۔

یہ فتنے کسی کی پتلون پہ ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تو اس لئے نہیں کہ اُسے ننگا کر دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ ننگے پن کا احساس اس کی روح میں جذب کر دیا جائے۔ اور آئندہ کے لئے سند رہے۔!

آپ کہیں گے یہ کیسے فتنے ہیں۔ کہ لوگوں کی پتلونوں پہ ہاتھ ڈالتے ہیں جیبیں کھنگالتے ہیں۔ پگڑیاں اچھالتے ہیں۔ اور گریبان پھاڑتے ہیں مگر فتنہ پرداز نہیں ٹھہرتے —؟

گزارش یہ ہے۔ کہ اگر گریبان چاک ہونا مقدّر میں لکھا ہو۔ تو پھاڑنے والا کس حد تک موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے — وہ لوگ جو محبت سے بھی قابو نہیں آتے۔ انہیں آئینہ دکھا کر زیر کرنا پڑتا ہے۔ تو دوستو یہ فتنے محبت کرنا جانتے ہیں۔ یہ ہمیشہ محبت کا وار کرتے ہیں۔ لیکن

وہ بدقسمت، جو محبت کے جال میں پھنسنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جو محبت کے وار سے بچ نکلنے میں بھی عافیت سمجھتے ہیں۔ بالآخر اپنا گریبان چاک کروا لیتے ہیں۔ کیوں کہ اصول ہے۔ کہ پانی اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے ——!

فتنہ نمبر ا سے ملاقات کو ڈھائی تین سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ مگر اتفاق سے میں جس اخبار کو برسہا برس سے پڑھ رہا ہوں۔ اس میں "روزن دیوار" سے" کے عنوان سے ایک کالم کبھی کبھار نظر سے گزر جاتا تھا۔ مگر کالم پڑھنے کا اتفاق یوں نہ ہوتا تھا۔ کہ نہ تو لکھنے والے کی تصویر بہت خوبصورت تھی۔ اور نہ نام میں کوئی ادیبانہ کشش تھی —— سوچا۔

یہ بھی رفیق ڈوگر قسم کی کوئی چیز ہوگی —— !

لہٰذا بہتر ہے " روزن دیوار سے" پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اغوا یا عصمت دری کی چٹ پٹی خبر پڑھی جائے۔ شاید کوئی پلاٹ ہاتھ لگے اور افسانہ بن جائے۔

یوں جہاں تک ممکن ہو سکا " روزن دیوار سے" جھانکتے ہوئے فتنے سے بچے رہے!

پھر جانے کیا ہوا کسی ڈائجسٹ میں یا " فنون" میں " شوق آوارگی" کے عنوان سے سفر نامے کی ایک قسط پڑھی —— یہ ایک بے ساختہ تحریر تھی جس کا لکھنے والا مشرق کا روایتی شہزادہ نہیں تھا۔ بلکہ

پکا لاہوریا تھا۔ جو خوبصورت اردو لکھتے لکھتے معاً کسی فقرے میں موزوں جگہ پر پنجابی کی چونڈی لگا جاتا تھا۔ اور پڑھنے والا گدگدا کر پھڑک اٹھتا تھا۔

مجھے بڑی مسرت ہوتی۔ اگر اس لکھنے والے کا نام عطاء الحق قاسمی کی بجائے عطا لاہوریا ہوتا!

چنانچہ پہلی بار روزن دیوار میں سے جھانکتی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ ہو نہ ہو۔ ساتویں آٹھویں پشت میں مجید لاہوری سے ضرور تعلق رہا ہوگا۔ یوں میں نے مجید لاہوری کے رشتے سے عطا لاہوریا کا کالم پڑھنا شروع کیا۔ اور اس میں سچ مچ نمکدان کا مزہ پایا۔ یقین کیجئے۔ وہ دن، اور آج کا دن، میں نے عطا لاہوریا کا کالم پڑھے بغیر نہیں چھوڑا ایم اے او کالج میں پڑھاتا ہے۔ اور اردو کا استاد ہے۔ "شوق آوارگی" کی قسط پڑھنے کے بعد اس کے استاد ہونے کا تصور میرے لئے خاصا تکلیف دہ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ کہ جن جینئس لڑکوں کو چیف کالج، گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج، اور دیال سنگھ کالج میں داخلے نہ مل سکے ہوں۔ ایم اے او کالج میں ان کے استاد عطا لاہوریا جیسے نہ ہوں گے۔ تو وہ قابو کس طرح آئیں گے۔!

حلقۂ ارباب غالب کی کسی نشست میں میں نے پہلی بار عطا کو دیکھا۔

سرخ و سفید رنگ، موٹے موٹے مردانہ نقش، بڑی بڑی خوبصورت شفاف آنکھیں، اگر یہ آنکھیں کسی لڑکی کے چہرے پہ ہوتیں، تو میں بلا دریغ پورے پچاس صفحے کا افسانہ لکھ سکتا تھا۔

میں نے دیکھا۔ عطا کی تحریر میں جو بے ساختگی ہے۔ وہی بے ساختگی اس کی ہنسی میں بھی ہے۔ وہ اس طرح کھل کر ہنستا ہے۔ کہ اس کی باچھیں، اس کے کانوں کی لویں کراس کر جاتی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ایسا بے ریا قہقہہ جس میں جسم و روح کا ہر گدانہ شامل ہو جائے کسی منافق آدمی کی قسمت میں نہیں ہوتا۔!

عطا سے قلبی قربت میں نے اس دن محسوس کی۔ جب میری ایک کتاب کی تقریب کی خبر عطا نے کہے بغیر نہایت اہتمام سے نوائے وقت میں چھاپی۔ تب میں نے دل ہی دل میں سوچا ——لاہوریئے اتنے بُرے تو نہیں ہوتے ——!

اور یہ بھی، کہ اس شخص پر اعتبار کیا جاسکتا ہے —— یوں عطا لاہور یاد شک دیئے بغیر میرے سینے کے کسی نرم گوشے میں آبیٹھا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ میں کم آمیز آدمی ہوں۔ اور جن لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ ان پہ اپنے اخلاص کا مظاہرہ تیز بارش کی طرح نہیں کر سکتا۔ بلکہ دھیمے دھیمے، ہلکے ہلکے پھوار کی طرح غیر

محسوس انداز میں جذب ہوتا رہتا ہوں ـــ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ میری محبت، برائے محبت کے بجائے محبت برائے زندگی بن جاتی ہے ـــ اور اظہار کے عذاب سے بھی بچ جاتا ہوں۔

عطا لاہوریا سے بھی میرا اسی طرح کا نازک رشتہ ہے۔

لاہوریا کہہ کر یہ نہ سمجھئے گا۔ کہ میں عطا کو ڈی گریڈ کر رہا ہوں خود عطا نے بھی قاسمی ہونے کے امتیاز کو سراہا ہے۔ کیونکہ اس طرح جناب احمد ندیم قاسمی کے صف میں کھڑا ہونے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے ـــ لیکن میں جس مفہوم میں لاہوریا کہتا ہوں۔ وہ مفہوم بہت اعلیٰ اور ارفع ہے ـــ یہ داتا کا لاہور ہے۔ یہاں مزارِ اقبال ہے، یہاں منٹو دفن ہے ـــ یہ مجید لاہوری کا لاہور ہے۔ یہ ان لوگوں کا لاہور ہے۔ جو خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت سرگوشی کرتے ہیں۔

"کیوں گامیا کی حال اے ـــ ؟"

اور گاما پورے خلوص سے کہتا ہے ـــ

بڑا اچھا اے یار نے تو ئے پر لاہور لاہور اے۔

تو یہ ہے لاہور، جو گامے اور اقبال دونوں کا پسند تھا۔ جو داتا کا مسکن بنا، اور نوادر، خود میں، جو کبھی کوہاٹ تھا، سرحدی تھا۔ اب لاہوریا ہوں۔ لیکن میری بدقسمتی، کہ کوشش کے باوجود لاہوریا لہجہ

میری ماں کے دبے ہوئے لہجے پہ غلبہ نہ پا سکا۔ مگر اپنی اس خواہش کو عطا لاہوریا کے نذر کرتا ہوں۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ عطا قاسمی کو عطا لاہوریا کہہ کر میں نے ڈی گریڈ نہیں کیا۔

بلکہ اپنے بہت سارے نیک جذبوں کی یکجائی کا نام لاہوریا بنتا ہے۔ لاہوریوں کی ایک "قلندرانہ صفت" میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دیکھی ہے۔ جب یہ لاٹھیاں اور برچھیاں لے کر واگہ بارڈر کی طرف چل پڑے تھے ۔۔۔ جو چلنے کے قابل نہیں تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے لئے چاول اور حلوے کی دیگیں چڑھائی تھیں۔ اور جن کو واگہ کی طرف جانے والے جم غفیر میں راستہ نہ ملا۔ انہوں نے گنگارام اور میو ہسپتال میں میلوں لمبی لائنیں لگا کر منوں اور ٹنوں کے حساب سے جیتا جیتا خون دے ڈالا۔ سرسید کے کالج کی تعمیر کے لئے زندہ دلان لاہور نے چاندی کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ پاکستان کی دھرتی کو بچانے کے لئے لاہوریوں نے لہو کی نہر نکال دی تھی۔

اس لئے اگر میں کبھی محبّ وطن لوگوں کی فہرست مرتب کروں گا۔ تو لاہوریوں کو سرِ فہرست رکھوں گا ۔۔۔ اس فہرست میں ایک نام عطا لاہوریا کا ہو گا۔ عطا کا یہ پہلو بہت واضح طور پہ سامنے آتا ہے جہاں بھی اور جب بھی وطن کی بات ہوتی ہے۔ عطا کا ذہن ہمیشہ صاف

ہوتا ہے۔ وہ ہر اس آدمی کا سامنا کرتا ہے۔ جو وطنِ عزیز کے خلاف زہر اگلے۔ ایسے مواقعوں پہ وہ لاہوریا سے بھی دو قدم آگے نکل جاتا ہے اور مکمل فتنہ بن جاتا ہے۔

بالکل وہ فتنہ، جس کا مفہوم میں شروع میں بتا چکا ہوں۔

وہ لوگوں سے لڑتا ہے۔ تحریری اور زبانی ہر طرح کی جنگ پہ آمادہ ہوتا ہے پھر پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ پاکستان کا سوال ہوتا ہے۔ اور وہ لاہوریا نہیں رہتا۔ پکا پاکستانی بن جاتا ہے۔ مجھے اس کی یہ ادا ہمیشہ سے پسند رہی ہے۔

وہ احباب جو پنجابی زبان کی الگ دکان سجائے بیٹھے ہیں عطا ان کی بھی خبر لیتا ہے۔ وہ لوگ جو مہاجر تھے۔ ہمارے مہمان تھے۔ اور اب ہمارے ہم وطن ہیں۔ ہمارے بھائی ہیں۔ کبھی ٹیڑھی بات کرتے ہیں۔ تو عطا کا سرخ چہرہ اور زیادہ سرخ ہو جاتا ہے۔ پٹھان بلوچی اور سندھی کے بارے میں بھی ان کا یہی رویہ ہے۔ وہ سب کو آنکھوں میں بٹھاتا ہے۔ مگر پاکستان کے خلاف بات سننے کا روادار نہیں۔ اور بھی کتنی باتیں ہیں۔ جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہیں۔

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ جس اخبار میں وہ ہفتے میں ایک بار کالم لکھتا تھا۔ اب تقریباً روزانہ کی چیز بن گئی ہے۔

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ جس اخبار میں سوشلسٹوں کا ذکر شجرِ ممنوعہ ہے۔ وہاں وہ کمال صفائی سے دوستوں کے کام آتا ہے۔؟

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ خدا کا بندہ ہونے کے باوجود وہ کارل مارکس کے بندوں سے بھی پیار کرتا ہے۔؟

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ اس نے اپنے اخبار میں ادبی ایڈیشن شروع کیا۔ تو دوسرے اخباروں کو اس کی تقلید کرنا پڑی۔؟

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ اس نے خبر کو ادب کی اہمیت کا احساس دیا۔؟

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے کہ اس کا ادبی ایڈیشن ملک کے گوشے گوشے میں پڑھا گیا؟

کیا یہ عطا کا کمال نہیں ہے۔ کہ شہر شہر، قریہ قریہ کی ادبی سرگرمیاں اجتماعی شکل میں سامنے آئیں؟ خود اس کا ادبی کالم جو ادبی ایڈیشن کی جان ہوتا ہے، روزِ اوّل کی طرح تازہ اور شگفتہ ہے۔

ایک زمانہ تھا۔ جب میں زمیندار پڑھتا تھا۔ میں اپنے گاؤں میں پہلا آدمی تھا۔ جس کے نام اخبار جاری کیا تھا۔ زمیندار میں حاجی لق لق کا کالم میرا پسندیدہ کالم ہوتا تھا۔ آج نوائے وقت میں "روزن دیوار سے" میرا اسی طرح کا پسندیدہ کالم ہے۔

اگر میں نے عطا کو عطا لاہوری یا نہ کہا ہوتا۔ تو اُسے حاجی لق لق کی رعایت سے اسے مولوی لق لق کہتا رمولوی اس لئے، کہ ناصر زیدی اسے مولوی کہتا ہے۔ اس کا پس منظر کیا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ لیکن جب ناصر زیدی اسے مولوی کہتا ہے۔ تو عطا کی شفاف آنکھوں میں اس ثقیل لفظ کے لطیف معنی صاف نظر آتے ہیں۔

عطا دوستوں کو گالیاں اس خلوص و محبت سے دیتا ہے۔ جیسے اُن کے کوٹ کے کالر پر پھول جڑ رہا ہو۔ اور اسی شوق و ذوق سے دوستوں کی گالیاں ہضم بھی کرتا ہے۔

میں جب شروع شروع میں لاہور آیا۔ اور بڑے بڑے شرفا کو اظہار محبت کے طور پر گالی گلوچ میں ملوّث پایا۔ تو بہت حیران ہوا۔ کیونکہ میں جس خطے سے آیا تھا وہاں تہذیبی دباؤ اس قدر تھا ــــ

کہ ادھر زبان سے گالی نکلی۔ اور ادھر بندوق سے گولی نکلی ــ

میرے لئے یہ امتحان تھا۔ میں نے ہر چند اس تہذیبی دباؤ سے نکلنے کی کوشش کی۔ کہ میں کچھ لوگوں کی محبّت جیتنا چاہتا تھا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ورنہ میں عطا کے کوٹ پر پھول ضرور جڑتا ــــ لیکن صبر یوں آ گیا۔ کہ اپنے ندیم صاحب بھی تو اس دولت لازوال سے محروم ہیں ــ!

عطا کی ایک صفت کا ذکر نہ کیا جائے۔ تو یاران محفل سے زیادتی

ہوں۔ عطا کچھ غلط بھی نہیں کہتا۔

اتفاق سے جب بھی ہم اکھٹے کسی حسینہ کے گھر گئے۔ یہ حیلے بہانے سے جم کر بیٹھ گئے۔ ٹی ہاؤس میں ہمیشہ ایک کپ چائے پیتا ہے — لیکن گھر حسینہ یا نیم حسینہ کا ہو۔ تو عطا وہاں دو کپ چائے پیتا ہے۔ اس طرح وہاں پر اجمان ہونے میں بیس پچیس منٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو ایک کلا کار کے لئے نہایت قیمتی چیز ہوتی ہے۔

لیکن گھر پرایا ہو۔ تو آخر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ مگر عطا کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ وہ اگر عورت بن کر لڑکی کے پاس پہنچ سکتا ہے۔ تو مرد ہو کر حسینہ کے گھر کی راہ کیوں بھولے گا — ظاہر ہے جانے وقت عطا وہاں کا گلنر یا مفلر بھول جائے گا — دوسرے دن فون کرے گا — اگر فون میں صاحب خانہ کی آواز سنائی دے — تو یہ رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دے گا۔ لیکن آواز صنف نازک کی ہو — تو عطا کی باچھیں کھل جائیں گی —

پھر گا گلز یا مفلر کا ذکر، اس کے بعد خیریت اور صحت، اور آخر میں صاحب خانہ کا ذکر، کہ وہ کس وقت گھر لوٹے گا۔ اور پھر اسی بار جس سے عطا اپنے مشہور زمانہ سکوٹر کو کک مارے گا۔ کوچہ دلدار میں اترے گا — حسینہ مذکور کو اپنے شوہر نامدار سے بہت عقیدت اور

ہوجائے گی۔ یہ صفت عطا کے علاوہ تقریباً سارے شاعروں اور ادیبوں اور فنکاروں میں یکساں ہوتی ہے۔۔۔ بھلا پھول کسے اچھے نہیں لگتے۔ چاند سے پیار کون نہیں کرتا۔ حسینوں کا ذکر شاعر اور ادیب نہیں کریگا۔ تو کیا مکین افلاک کریں گے۔۔؟

ٹھیک ہی تو ہے۔ قصۂ زمین قصۂ فلک کیوں بنے؟

جاپان کے پہلوان انوکی کی بیوی کی خوبصورت تصویر اخباروں میں چھپی۔ تو عطا نے کہا۔

"پہلوئے لنگور میں حور خدا کی قدرت ہے!"

لیکن جس دن انوکی کپڑے اتار کر اکھاڑے میں اترا۔ تو اس کا خوبصورت جسم دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ عطا نے بھی اپنے الفاظ واپس لے لئے اور بولا۔

"انوکی کی ایکٹریس بیوی نے شوہر کے انتخاب میں غلط فیصلہ نہیں کیا۔"

اس انتخاب کو مزید تقویت پہنچانے کے سلسلے میں عطا نے کہا۔

میں عورت ہوتا۔ تو بلا دریغ انوکی کے پاس پہنچ جاتا!"

لیکن خوش قسمتی سمجھئے۔ کہ وہ مرد ہے۔ اور جاپان نہ پہنچ سکا۔ اور ہم رسوائی سے بچ گئے۔ ورنہ جہاں تک پہنچنے کا سوال ہے۔ میں جانتا

وابستگی سہی۔ مگر عطا کا یہ بے ضرر سا گھنٹہ پون گھنٹہ اگلے دن کے کالم لکھنے میں بے حد معاون ثابت ہو گا۔

عطا شہر لاہور کا واحد ادیب ہے۔ جو ادب کے سرگودھا گروپ، پنڈی کے فوجی گروپ، کراچی کے اہل زبان گروپ، اور لاہور کے "زباندان گروپ" کو اپنے انداز میں ڈیل کرتا ہے۔ وہ سب کا چہیتا ہے۔ سب کا وفادار ہے۔ مگر ان سب پھیلی ہوئی وفاداریوں کے باوجود ایک اچھے باپ کی طرح وہ بنیادی طور پر محمد یاسر کا وفادار ہے۔ اور ان گنت پھیلے ہوئے عشقوں کے باوجود وہ ایک اچھے شوہر کی طرح محمد یاسر کی ماں کا بھی وفادار ہے۔ یقین نہ آئے۔ تو رائٹرز گلڈ کے دفتر میں دیکھ لیجئے۔ وہ جو دس مرلے کا مربع عطا کو الاٹ ہوا ہے۔ اس کا وارث محمد یاسر کی ماں ہے۔

میری خوش قسمتی دیکھئے۔ کہ مجھے جو مربع الاٹ ہوا ہے۔ اس کا دروازہ بھی اس فتنے کے دروازے کی طرف کھلتا ہے ــــ پشتو میں ایک مثل ہے کہ مکان خریدنے سے پہلے ہمسایہ خرید لو ــــ یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ کہ فتنے کا بیٹا میرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے !؟

یہاں قصہ ختم ہوتا ہے پہلے درویش کا، اور کہانی شروع ہوتی ہے

دوسرے درویش کی، فتنہ نمبر ۲ سے میری ملاقات دفتر فنون میں اس زمانے میں ہوئی تھی۔ جب وہ چٹپٹا سا، سانولا سا، پیارا سا لڑکا تھا ــــ میں ہوں تو پٹھان، مگر شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے مکتب فکر سے تعلق نہیں رکھتا۔ ورنہ یہ بہت اچھا موقع تھا، کیونکہ ندیم صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے۔ اور ہیرے کی طرح چمکدار آنکھوں والے اس طرح دار لڑکے کو میں مٹھائی کا جھانسہ ضرور دیتا ــــ!

اس کے علاوہ دفتر فنون کی تقدیس کا بھی خیال، اور دوسری طرف صنف نازک سے میرے کئی معرکے کے عشق، ان دنوں کئی بے مثال لڑکیوں کی محبت سے میرا سینہ بھرا بھرا تھا۔ اس لئے اس بانکے لڑکے کے لئے میرے دل میں ایسا جذبہ ابھرا۔ جس میں محبوب اور چھوٹے بھائی سے محبت کی ملی جلی شکل بنتی ہے۔

تعارف ہوا ــــ وہ مجھے جانتا تھا۔ تپاک سے بٹھایا۔ چائے پلائی۔ اور نہایت خود اعتمادی سے فنون کے لئے افسانے کی فرمائش کی ــــ

ندیم صاحب کے دفتر میں یہ لڑکا مجھے چھوٹا منہ بڑی بات کا مکمل نمونہ لگا۔ اس کی خود اعتمادی بھی اچھی لگی ــــ

مجھے یاد نہیں۔ میرے ساتھ کون تھا اس دن، باہر نکل کر پوچھا ــــ
"بھئی یہ فتنہ کون تھا۔ ؟"

معلوم ہوا۔ دفترِ فنون میں پروان چڑھنے والا یہ فتنہ دو عظیم افسانہ نگار بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا بھائی خالد احمد ہے۔!

بس وہ دن، یہ نام میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا ــــــ

بیچ میں کئی سال گزر گئے۔ خالد احمد میری آنکھوں سے اوجھل رہا۔ میری فلمی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ اور میں ادب سے کٹ گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب پھر سے ادب کی طرف مراجعت ہوئی۔ تو وہ نام جو ایک طویل عرصے سے ان گنت ناموں کے ڈھیر تلے دب گیا تھا بلکہ سسک رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ابھرنا شروع ہوا۔

وہی برخود غلط قسم کا لڑکا اب چونکا دینے والے شعر کہہ رہا تھا میں اب بھی اُسے وہی بانکا سا لڑکا سمجھ رہا تھا۔ کہ اچانک ایک دن اُسے ٹی ہاؤس میں فلک شگاف قہقہے لگاتا ہوا دیکھا۔ ارے واہ! یہ تو وہی ہے، وہی فتنہ!!

میلے کالر، پتلون کے پھٹے ہوئے پائنچے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دَور کے بوٹوں میں سے جھانکتی ہوئی ایڑیاں، ــــــ اور اس کے باوجود قہقہہ، مرکیاں در مرکیاں، بالکل روشن آرا بیگم والی مرکیاں، کوئی احساس کمتری نہیں، بلکہ پکے راگ کی ان مرکیوں سے ٹیبل کے اردگرد بیٹھے آٹھ دس آدمیوں کی ٹولی برابر محظوظ ہو رہی ہے۔ برابر مرعوب

ہو رہی ہے۔

یہ تھا اس کا دوسرا روپ، جوان فتنے کا!

اس کے حلیے بشرے سے ظاہر تھا۔ کہ بے روزگار ہے۔ مگر پھٹے ہوئے بوٹ کا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ کہ گردن بھی جھک جائے دفتر فنون سے کچھ اور پایا ہو یا نہیں۔ کم از کم یہ ضرور جانتا ہو گا۔ کہ وہاں کی روایت گردن کٹانا ہے۔ گردن جھکانا نہیں۔!

ایک اور بات جو مجھے اچھی لگی وہ بالکل بھاٹی گیٹ کے لہجے میں پنجابی بول رہا تھا۔ خوبصورت اردو بولنے والی عظیم بہنوں کا یہ فتنہ بھائی اس بے ساختگی سے پنجابی بول رہا تھا۔ کہ جائے عبرت تھی ان لوگوں کے لئے جو کہتے ہیں ـــ" اس مٹی میں اپنانے کی خصوصیت نہیں ہے!؟"

لاہور کی مٹی، جو نہ صرف خالد کے پھٹے ہوئے بوٹوں سے تہہ در تہہ بغل گیر تھی۔ اس کے ہیرے جیسی آنکھوں کے پلکوں پر بھی جمی ہوئی تھی بلکہ اس کی روح اور شعور میں تحلیل ہو کر لکھنؤ کے بانکے کو پنجاب کا گبھرو بنا دیا تھا ـــ

میں حیران ہوں۔ لوگ تاریخ کی کروٹ کا انتظار کئے بغیر فیصلے سنا دیتے ہیں۔ پھر ان کی اولاد ساری زندگی تنہا سارہتی ہے۔ کہ انکے

بڑوں کو تاریخ کی کروٹ کا شعور نہیں تھا؟۔

وقت گزرتا ہے میں آوارہ منش نوجوان کو دیکھتا ہوں ـــ لاہور کے فٹ پاتھوں پر، فنون کے دفتر میں۔ ٹی ہاؤس میں، ادبی محفلوں میں، ہاتھ میں بڑے سائز کا خاکی لفافہ، جو ظاہر ہے دفتر فنون سے اڑایا ہوگا لفافے میں کتابیں، کچھ مانگ تانگ کی' اور کچھ چال کا حصہ' وہی شڑاپ شڑاپ کرتے ہوئے چارلی چیپلن کے بوٹ' وہی روشن آرا بیگم کے پکے راگ کی مرکیوں جیسے قہقہے' وہی تیکھے فقرے' وہی عطا کی سی گالی گلوچ وہی ہر ایک کو چیلنج کا انداز ہ' وہی زمانے بھر کو نیچا دکھانے کا رویہ ـــ اور پھر بھی مجھے اس پر غصہ نہیں آتا۔

اس کی کج روی میں ذہانت کی ایسی لپک ہے۔ جو مجھے پسند ہے۔ اس لپک میں بیک وقت تیرگی بھی ہے روشنی بھی، بالکل سورج جیسی' کہ نظر ملاؤ تو تاب نظارا نہیں۔ نظر ہٹاؤ' تو نظارے ہی نظارے !

میں ٹیڑھے لوگوں سے واسطہ نہیں رکھتا۔ میں ایسے لوگوں کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر یہ خالد کے رویے کی بے ساختگی ہے۔ کہ مجھے اس کے ٹیڑھ سے پیار ہے۔ جس طرح عدم صاحب کی سادگی مصنوعی نہیں ہے۔ جس طرح ندیم صاحب کی شرافت مصنوعی نہیں ہے۔ اسی طرح خالد کی ٹیڑھ بھی مصنوعی نہیں ہے۔

یہ ٹیڑھ جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک پہلو اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کوئی تقریب ہو رہی ہو۔ اور اس کی باگ ڈور خالد کے ہاتھ میں ہو۔ خالد بار بار جھومتا جھامتا مائیک پر آتا ہے۔ اس کا جھوم جھام کر آنے کا انداز بالکل کسی نمبری کا سا ہوتا ہے ـــــ مائیک پر کھڑا ہو کر جب وہ چند ثانیے کے لئے خواتین و حضرات پر نظرِ کرم ڈالتا ہے۔ تو ایسا لگتا ہے کہ مجمع میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن سے انتقام لینے کا یہی وقت معیّن ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دشنام طرازی پر اتر آئے گا۔

مگر نہیں، وہ بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں جانے والے مضمون نگار کو داد' اور آنے والے مضمون نگار کو خوش آمدید کہے گا ـــ اور تب خود بخود یہ فیصلہ بھی ہو جاتا ہے۔ کہ یہ جھومتا جھامتا کندھے اُچکا کر آنے والا آدمی نمبری نہیں ادیب بھی ہے!

خالد حلقہ اربابِ غالب کا غالب ہے۔ یہاں اس نے بڑے بڑے تسکرے پال رکھے ہیں۔ تسکرے اُن معنوں میں نہیں، جو روایتی طور پر مشہور ہیں، بلکہ ان معنوں میں جو بانگ درا اور بال جبریل میں لکھے ہوئے ہیں ـــ خالد جب چاہتا ہے۔ اور جہاں چاہتا ہے۔ یہ شاہین بچے اچانک جھپٹ پڑتے ہیں۔ اد

مخالف کیمپ کی آنکھوں میں پنجے گاڑ دیتے ہیں۔

خالد لاہور کی ہفتہ وار ادبی محفلوں کی جان ہے — وہ شعر پر بڑی جچی تلی رائے رکھتا ہے۔ افسانے پر بھی بحث کر لیتا ہے۔ اور عام مضامین پر بھی اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے اظہار کرتا ہے۔ عام طور پر ان مباحث میں اپنے اپنے مطالعے اور علمیّت کا بھونڈا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو رد کرنے کا رویّہ ہوتا ہے جس سے مبتدی قسم کے لوگ کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مگر یہاں میں خالد کی نکتہ آفرینی کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ نہایت سلیقے سے اور بیحد خوبصورت انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ ان مجالس میں اگر کسی ادب پارے پر بحث طول پکڑ گئی۔ تو میں نے اکثر مواقعوں پر اپنے آپ کو خالد کے قریب پایا —

شاید یہ بھی ایک وجہ ہو۔ کہ میں خالد کو پسند کرتا ہوں۔

خالد کے ایک پہلو کا ذکر نہ کیا جائے۔ تو شاید بات تشنہ رہے۔ خالد چھیڑ چھاڑ کا بیحد ذوق رکھتا ہے۔ وہ اپنے ہم عمروں کو تو چھیڑتا ہی ہے۔ بزرگوں کو بھی چھیڑنے سے باز نہیں آتا۔ حیرت ہے کہ ابھی تک اس کا گریبان سلامت ہے۔ ورنہ اس سلسلہ میں اس

بیچارے نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ۔!

اس کی اس خوبی کا تذکرہ بیرون لاہور میں بھی ہوتا ہے۔ ایک بار پنڈی میں کسی نے پوچھا ۔۔۔

خالد کا کیا حال ہے ۔۔ ؟

میں نے کہا ۔۔" کونسا خالد ۔۔ ؟ خالد احمد، محمد خالد اختر، خالد شریف یا عبدالعزیز خالد ۔۔ ؟"

بولے ۔۔" ابن احمق کا پوچھ رہا ہوں ۔۔ !"

میں نے کہا ۔۔" ابن انشا اور ابن صفی تو کراچی میں رہتے ہیں۔؟"

"نہیں بھئی ۔۔" وہ چڑ کر بولا ۔۔" ابن احمق لاہور میں رہتا ہے ۔ بسنت روڈ پہ !"

بسنت روڈ کا نام سن کر میں چکرا گیا۔ میں نے چوبیس برس میں پہلی بار بسنت روڈ کا نام سنا تھا۔ وہ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر ہنس پڑا۔

"ارے بھی نسبت روڈ کی بات کر رہا ہوں !"

اب میری باچھیں کھل گئیں ۔۔" تو پھر تم خالد احمد کا پوچھ رہے ہو !

"درست !" اس نے دلجمعی سے کہا۔ اس کے لہجے میں پیار تھا ۔" وہی منحوس ہے ابن احمق، کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ احمق زادہ ہاجرہ مسرور کا بھائی ہے اور خدیجہ مستور کا برادر خورد !"

برادر خورد پر یہ صاحب پھر ہنس پڑے اور بولے ۔" شاید آپ کو معلوم نہیں کہ خالد احمد لکھنؤ کے مشہور مذاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی کے پسر خورد ہیں ۔ ؟"

میں اس انکشاف پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی،

خوش اس لئے کہ خالد کو سٹور کہنے والے بھی اُسے اتنا ہی پیار کرتے ہیں ۔ جتنا کہ فتنہ کہنے والے اس سے کرتے ہیں ـــ اور حیران یوں ہوا ۔ کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں ۔ جو خالد کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں ـــ

اس سب کے باوجود، جس دن یہ خبر اڑی ۔ کہ خالد کی شادی ہو رہی ہے ۔ تو کسی نے بھی جو خالد کو جانتا تھا ۔ اس انہونی پر یقین نہ کیا ۔ بھلا وہ کیسی بدقسمت لڑکی ہو گی کہ اس شاعر بے سنر کے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے گی ۔ اور وہ کیسے والدین ہوں گے ۔ کہ اس آوارہ شہر کو داماد کہنے پر راضی ہو جائیں گے ـــ!؟

لیکن انہونی، ہونی میں بدل گئی ۔ اس دن بہت سے شاعر اور ادیب وہ لمحہ حیرت دیکھنے کے لئے نسبت روڈ آ گئے ۔ کہ دیکھیں، سٹور کے سر پر سہرا کس طرح باندھتے ہیں!

جماعت اسلامی کا آدمی وہاں، روس اور چین کی نمائندگی وہاں، اور

محب وطن کہلوانے والے ادیبوں کا تو شمار ہی نہیں تھا ـــ میں نے
ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا۔ کہ جناب حفیظ جالندھری، جناب فیض احمد
فیض، اور ندیم صاحب بیک وقت اس فتنے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ !
اور لمحۂ عبرت تو وہ تھا۔ جب میں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے
بوٹوں کی جگہ خالد کے پاؤں میں بیسویں صدی کے آٹھویں دہے کے
نہایت ہی ماڈرن بوٹ دیکھے۔ اس کا قد چند انچ بڑھ گیا تھا۔ اور وہ
لندھوروں کے کندھوں سے کندھا ملا کر فوٹو اتروا رہا تھا۔
یقین کیجئے۔ یہ روز حساب نہیں تھا۔ بلکہ عام دنوں کی طرح ایک
دن تھا۔ کہ خالد اپنے شاہین بچوں کی فوج ظفر موج کے سہارے ایک
معصوم لڑکی کی ڈولی نسبت روڈ اٹھا لایا تھا۔ اور یقین کیجئے۔ وہ دن
بھی دور نہیں۔ جب یہ احمق زادہ، ایک شیطان زادے کو جنم دے گا۔
اور میں اُس پنڈی والے ادیب کو تار دوں گا ـــ کہ لو، کار جہاں
دراز است، مشنری ہوشیار باش،

کہ پسر احمق نے پدر شیطان کا روپ دھار لیا ہے ـــ !
تو دوستو ـــ اس طرح کہانی ختم ہوتی ہے دوسرے درویش کی،

اب میں تیسرے فتنے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں ـــ
بہت دور کی بات نہیں۔ میں دفتر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا رمّی

کھیل رہا تھا۔ دنیا کے ایک ہزار عیبوں میں یہی ایک عیب ہے۔ رمی کھیلنے کا، ورنہ میں بہت ستھرا آدمی ہوں۔ مگر ہمارے کچھ دوستوں کو ہمارا یہ معصوم سا عیب بھی کھلتا ہے۔ وہ بضد ہیں، کہ ہمیں فرشتہ بنائیں گے اور ہم مجبور، کہ رمی کھیلیں گے — اور آدمی کی خو بو نہیں چھوڑیں گے —

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ جب میں رمّی کھیل رہا تھا۔ محترم اسرار زیدی دفتر آئے۔ ایک بالغ بچہ بھی ان کے بغل میں تھا۔ میں نے زیدی صاحب کی تیکھی چتون دیکھ کر رمی چھوڑ دی۔ اور ان ڈیڑھ آدمیوں کو خوش آمدید کہا — زیدی صاحب نے بغل میں دبائے ہوئے بچے کی طرف دیکھا — اور بولے۔

پروفیسر گلزار وفا چودھری، دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے ہیں۔ حلقہ دام خیال کے کرتا دھرتا ہیں۔ تب میں نے تپاک سے اپنا پٹھانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اور اگلے لمحے ایک سانولا سا، منا سا ہاتھ، مانند دل میری انگلیوں میں تڑپ اٹھا — میں نے جلدی سے یہ ہاتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ اندیشہ سا محسوس ہوا۔ کہ اس فتنے کے ہاتھ کی گرمی میرے ہاتھوں کی شریانوں میں سے تیرتی ہوئی میرے دل تک پہنچ جائے گی۔ اور میں اسی کا ہو کر رہ جاؤں گا!

کیونکہ اس جادوئی ہاتھ کے علاوہ اس بالغ بچے کے لبوں پر ایک

نہایت خطرناک قسم کی مسخر انگیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی ———
یہ آدھی شخصیت۔ دو دھاری تلوار سے مسلح تھی جس سے بچنا میرے لئے لازم تھا۔!

لیکن سچی بات یہ ہے۔ آج تک معلوم نہ کر سکا۔ کہ میں اس کے وار سے بچ نکلا ہوں۔ یا شکار ہو چکا ہوں ——— ؟

معلوم ہوا کہ حلقہ دام خیال محترمہ اُمّ عمارہ کے ساتھ دیال سنگھ کالج میں کسی تقریب کا اہتمام کر رہا ہے ——— اور محترمہ کا اسکیچ لکھنے کے لئے قرعہ فال میرے نام پڑا ہے۔

میں بڑی طرح بدکا ——— محترمہ اُمّ عمارہ سے تو میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ ایک گھریلو قسم کی فلاقات کے بعد میں ان کی شخصیت پر کیا لکھ سکوں گا۔ اور پھر میں نے کبھی خاکے لکھے بھی نہیں تھے یہ کام تو محمد طفیل صاحب کو سجتا ہے ——— لیکن یہ آدھا آدمی بضد تھا۔ اور اس طرح اصرار کر رہا تھا۔ جیسے مجھ پر ایک سو ایک احسان کر چکا ہو۔ اور اب اس کا بدلہ چکانا میرے لئے لازم ہو۔

بہت ممکن تھا میں انکار کر دیتا۔ انکار اس لئے بھی، کہ میں اس کام کا اہل نہیں تھا۔ مگر ایک تو اُم عمارہ کا احترام اور دوسرا وہ مناسا ہاتھ جس کے ملسن کی گدگدی میں ہتھیلی پر محسوس کر رہا تھا۔ اور وہ سحر طراز مسکراہٹ

جس میں تصنع کا ذرا بھی شائبہ نہیں تھا۔ جس نے مجھ سے انکار کی قوت چھین لی تھی۔ میں نے خاکہ لکھنے کی ہامی بھر لی ۔ ۔!

خاکہ لکھنے بیٹھ گیا۔ تو ذہن کے کئی دریچے کھل گئے ۔ اور مجھ پر منکشف ہُوا۔ کہ اس منے سے آدمی نے میری کن کن خفیہ صلاحیتوں کا سراغ لگا یا ہے ۔ بس پھر کیا تھا۔ میں خاکے پر خاکہ اڑا رہا ہوں ۔ اور یہ سارا کریڈٹ اس پرائیویٹ سر اسراساں کو جاتا ہے جس نے پہلے ہلے میں میدان سر کر لیا۔

حلقہ دام خیال کی اس تقریب میں جب گلزار بار بار اعلان کرنے کے لئے اسٹیڈ پر آتا۔ تو میں بہت محظوظ ہوتا۔ لکڑی کے اسٹینڈ کو اپنی قدو قامت پہ ناز۔ کہ اس نے ایک سرو قد آدمی کو اپنے سامعین سے آنکھ ملانے سے روک رکھا ہے۔ اور ادھر گلزار وفا چودھری کا عزم "کہ نہ سہی" میں تمہاری گدرائی چھاتی پر کہنیاں نہیں ٹیک سکتا۔ مگر میری آواز تو تیرے سر پر غرور سے تیر کر سامعین تک پہنچ رہی ہے۔!

اور یہ واقعہ تھا۔ کہ سامعین اس کا نوٹس لے رہے تھے ۔ نہ لیتے تو مجھے یہ احساس کیسے ہوتا۔ کہ یہ آدمی جو پہلی ملاقات میں اتنا معصوم لگا تھا۔ دراصل اتنا معصوم بھی نہیں ہے !

یوں دھیرے دھیرے اس کی معصومیت کے جوہر کھلنے لگے۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ یسوع مسیح کی اس بھیڑ کے منہ میں اپنے قد

سے زیادہ لمبی زبان ہے ۔ اور وہ محاورہ بھی یاد آیا۔ کہ جتنا زمین کے اوپر، اتنا زمین کے اندر!

اس کا مظاہرہ ٹی ہاؤس میں اور خاص خاص محفلوں میں، جہاں خالد، عطا، گلزار اور اختر کاظمی اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہ وہ گلکاریاں ہوتی ہیں۔ کہ دیکھتے دیکھتے پھولوں کی رنگا رنگ تختے زمین سے اُگ آتے ہیں۔ اور ہر طرف مہکاریں پھیل جاتی ہیں۔

اتحاد اربعہ کی اس چوکھی میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے ۔ کہ کون ہار رہا ہے۔ کون جیتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے منہ پہ سکندری قہقہہ اور ہر ایک کی آنکھوں میں فتح کا پرچم لہراتا ہے۔

ان کی نوک جھونک محفلوں کی سرحد اس وقت پار کر گئی۔ جب خدا نے گنجے کو ناخن الاٹ کر دیئے۔ اور یہ صاحب قلم، صاحب کالم بھی بن گئے اور انہوں نے قومی اخباروں کے عوامی صفحات کو ذاتی رد و کد سے سیاہ کر دیا۔

کالم نگاروں کی جنگ اس سے پہلے بھی پڑھنے آئے ہیں۔ مگر اس انداز میں، کہ ذاتی پرخاش کو قومی یا عوامی مفاد سے جوڑ دیا جاتا۔ اور بات بن جاتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا — ذکرِ یار کا فسانہ اس لئے ضروری تھا۔ کہ صبح اخبار تقسیم ہو۔ اور شام کو ٹی ہاؤس میں گرم گرم

قہقہوں کا طوفان اٹھے۔ اور کسی کونے کدرے سے داد کا ڈونگرا آئے۔

"واہ — کیا پرخچے اڑائے ہیں!"

ایک دفعہ کا ذکر ہے — عطا، خالد سے کہہ رہا تھا "یار بہت ہوگئی۔ اب تم گلزار وفا کا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ بہت محسوس کرنے لگا ہے!"

خالد نے معصومیت سے کہا — "اچھا تو اس میں محسوس کرنے والی حس بھی موجود ہے میرا تو خیال تھا۔ تمہارے بغل بچے کا یہ خانہ خالی ہے۔!"

اور پھر وہی شیطانی قہقہہ، جو بعد میں روشن آرا بیگم کی چاندی کی طرح خوبصورت مرکیوں میں بدل گیا —

ایک دن گلزار وفا مجھے بیڈن روڈ پر مل گیا۔ کہنے لگا۔

"گل صاحب۔ ذرا اس خالد کو سمجھایئے۔ شاید آپ کی بات مان جائے؟"

پوچھا — "کیا ہوا — ؟

بولے — "ایک عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس کی عادت ہے کسی نہ کسی کی ہجو کرنا ورنہ اُسے روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ پہلے فلاں کے خلاف، پھر فلاں کے خلاف، اور اب میری باری آئی ہے!"

میں نے کہا — "کیسے سمجھاؤں۔ مجھے تو اس کی ٹیڑھ پسند ہے — اس کی فطرت کا ایک حصّہ کیسے نوچ لوں — ؟"

گلزار نے کہا— "آپ کی عزت کرتا ہے—"

میں نے کہا— "غنیمت ہے۔ !"

گلزار ہنس پڑا اور چلا گیا —— دوسرے دن نوائے وقت کا کالم پڑھا۔ لکھا تھا—

یہ خالد احمد بھی عجیب چیز ہے۔ ٹانگا نیکا سے لیکر ٹوکیو تک لوگوں کو چیلنج کرتا رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی الو کی اس کی گردن دباتا ہے۔ تو اکی کی طرح چیختا ہے۔

"چھڈ دے یار چھڈ دے —سمجھ آئی!"

"میں تو مذاق کر رہا تھا یار —سمجھ آئی !!"

"میں نے تو تیرا نام ہی نہیں لیا یار —سمجھ آئی !!!"

میں گلزار کا یہ کالم پڑھ کر بہت ہنسا —اور سیدھا ایک دوست کے پاس پہنچا۔ اور بتایا۔

"دیکھو— یہ فتنہ کل صلح صفائی کی باتیں کر رہا تھا۔ خالد کو سمجھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اور آج اس کی یہ گل افشانیاں دیکھو۔ دیکھو ذرا، یہ عیسٰے کی بھیڑ، یہ عیسٰے کی امت کا آدمی ہے۔ وہ عیسٰےؑ جو کہتا ہے۔ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مار دے تو دوسرا گال آگے کر دو۔!"

لیکن پھر خیال آیا۔ عیسٰےؑ کا بھی کیا قصور، یہ فتنہ تو مسلموں میں پلا ہے

اس اُمت میں پروان چڑھا ہے جس کا اصول ہے۔

دانت کے بدلے دانت' اور اینٹ کا جواب پتھر!

بات سے بات نکلتی ہے — جو شخص ہفتے میں دو بار عطا کے گھر بڑے پاٹے، کھاتا ہو۔ وہ بھی بھینس کے' اس سے ہم نرم ردیّے کی توقع کیوں رکھتے ہیں — اگر انجیل مقدس کا سبق اس فتنے کی روح میں ہوتا۔ تو وہ ہاتھ کیسے اٹھاتا — ظاہر ہے۔ جس طرح کے ماحول میں پلا ڈھلا۔ وہی اس نے کیا — تو ثابت ہوا کہ مذہب روح کا نہیں' ماحول کا نام ہے —

یہ اندر کا نہیں، باہر کا معاملہ ہے — !

اور اب اچانک انکشاف ہوا۔ کہ حلقہ ارباب غالب' گلزار کے ساتھ شام منا رہا ہے۔ یعنی حلقہ اربابِ غالب کے کرتا دھرتا خالد احمد اس شخص کے ساتھ شام منا رہا ہے۔ جسے صبح و شام چت گرانے کی فکر میں رہتا تھا — گویا یہ سب جھوٹ تھا۔ اور یہ دونوں نورا کشتی لڑ رہے تھے!

دوستو — باتیں بہت ہو چکیں۔ خالد کی شادی کا ذکر بھی ہو چکا۔ مگر افسوس، کہ مدعو ہونے کے با وجود میں گلزار کی بارات میں شامل نہ ہو سکا۔ بہر حال جو آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔ کانوں سے سنا — کہ گلزار کی بیوی امریکہ پلٹ ہے — !

گویا۔ یک نہ شد دو شد۔!

مجھے معاً پشتو کی معروف افسانہ نگار زیتون بانو یاد آ گئی۔ وہ پہلی بار میری بیوی سے ملی تھی۔ تو بے ساختہ بولی تھی۔" گل صاحب آپ دونوں بہن بھائی لگتے ہیں!"

میں نے سوچا۔ زیتون بانو کی بات درست ہو یا نہ ہو۔ لیکن میں وثوق سے کہتا ہوں۔ کہ گلزار اور مسز گلزار پچھلے جنم میں جڑواں بہن بھائی تھے۔!

یہ وہی لمحہ تھا۔ جب میرے دل سے دعا نکلی تھی۔ کہ یہ مُنے سے بچے پھلیں پھولیں۔ اور شاد و آباد رہیں۔ میری بڑی خواہش ہے۔ کہ یہ دونوں بچے مجھے لالہ کہیں۔ میں اس رشتے کا احترام اور فرض نبھانے کے لئے تیار ہوں۔ اس شرط پر کہ یہ جلد وارث تخت پیدا کر دیں۔ تاکہ میں کم از کم "تایا جان" تو کہلا سکوں۔!؟



بلیا نندہ

تاج سعید کی بیگم زیتون بانو کی کتاب "شیشم کا پتا" کی تعارفی تقریب لاہور میں منعقد ہوئی تو میں نے بھی مضمون پڑھا تھا مضمون کا عنوان تھا "سقراط و بقراط"

یہ زیتون بانو کا مختصر خاکہ تھا۔ مگر زیتون بانو کے حوالے سے "تاج سعید" کا ذکر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ بالکل اس طرح، جیسے آج "تاج سعید" پر لکھتے ہوئے زیتون بانو کا ذکر آ گیا۔

"تاج پشاوری ہے۔ بانو دیہاتن ہے۔ تاج ہندکو بولتا ہے بانو پشتو بولتی ہے۔ تاج اردو میں لکھتا ہے۔ بانو پشتو میں لکھتی ہے ــــ آداب ریختہ، کہ تاج چاند کو مذکر باندھتا ہے۔ اور ادائے پشتون، کہ بانو چاند کو مؤنث باندھتی ہے ــــ پٹھان دانشوروں کا خیال ہے۔ کہ یہ عجیب ستم ظریفی ہے۔ کہ چاند جیسی خوبصورت چیز کو چاند بی بی کی بجائے چاند خان کہا جائے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ایک شہری ہے۔ دوسرا دیہاتی، تو لینگویج پرابلم نے ان کی رومانیت کو خاصا زچ کیا ہوگا۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ قومی زبان نے ان کے سارے مسائل حل کر دیئے۔

دونوں اردو میں مکالمہ کرتے ہیں ـــــ شاید اظہار محبت کا پہلا مکالمہ بھی اردو میں ہوا ہو۔ یا د رہے کہ دونوں کی شادی محبّت کی شادی ہے۔ مگر اس میں کمال کنہیا کا کم رادھا کا زیادہ ہے۔ کہ نومن تیل بھی لائی اور ناچ کر دکھا بھی دیا۔

مگر خیر یہ تو ایک لمبی کہانی ہے۔ چار دیواری کے اندر جھانکنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

دونوں میاں بیوی جب اردو میں بات چیت کرتے ہیں تو اوپرے سے لگتے ہیں۔ لیکن جب ان کے بچے اردو بولتے ہیں تو ساری اجنبیّت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ان کا گھرانہ سچ مچ بین المملکتی یگانگت کی علامت بن جاتا ہے۔ اور تب محسوس ہوتا ہے۔ کہ اصل حقیقت تو نئی نسل ہے جو پاکستانی قومیّت کی اساس پہ پروان چڑھ رہی ہے۔ تبھی تو میں کہتا ہوں کہ بین الصوبائی اور بین الاضلاعی شادیاں بے حد ضروری ہیں اگر ہم تاج اور بانو کی غیر طبقاتی شادی کو مثال بنا کر آگے بڑھیں تو یقیناً نفرت کی اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔ جو دیمک کی طرح اندر

ہی اندر اس ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

جیساکہ میں کہہ چکا ہوں۔ بانو سچی کھری پٹھانی، تاج نرم و گداز شہری دونوں کے مزاج میں نمایاں فرق ہے۔ مگر اس کے باوجود گھریلو ہم آہنگی قابل رشک ہے۔

ان کے گھر میں جو رشین کتیا ہے۔ اور ایرانی بلی۔ اُن کی چشمک اور رقابت کے قصے دونوں میاں بیوی بڑے مزے سے سناتے ہیں۔ جانوروں کا ذکر اور اس لگن کے ساتھ،

تب میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ جو لوگ اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ ایسا مشفقانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اُن کی دوستی اور محبت پر کیونکہ بھروسہ نہ کیا جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے۔ کہ میں ان لوگوں سے بہت مانوس ہوں۔ اور جب بھی پشاور جاتا ہوں۔ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے باوجود انہی کے گھر ٹھہرتا ہوں۔ اگر کبھی کسی مجبوری سے ان کی طرف نہ جاؤں۔ تو شام کو ان کے بچے پوچھتے ہیں ــــ "انکل گل ابھی تک نہیں آیا ـــ ؟"

خصوصاً ان کے چھوٹے بیٹے بابر سے تو میری باقاعدہ دوستی ہے۔ اور دوستی بھی کیوں نہ ہو۔ کہ ماں باپ دونوں کی بہت سی خصوصیتیں وراثت میں لایا ہے۔

آٹھ سال کی عمر میں شعر کہنے کو مچل رہا تھا۔ غالباً اس کی ایک آدھ

نظم چھپ بھی چکی ہے۔

تاج سعید ریڈیو کی ملازمت کرتا ہے۔ قند کی ادارت کرتا ہے۔ دوہے اور گیت لکھتا ہے۔ اور چھوٹا موٹا کیا، اب تو ٹھیک ٹھاک ناشر بن گیا ہے۔

کوئی سال نہیں جاتا کہ میدانِ ادب میں تاج کی وساطت سے کسی نہ کسی کتاب کا چرچہ نہ ہوتا ہو۔

وہ بیحد فعال آدمی ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اور جب کچھ نہیں کرتا تو اپنی کتاب چھاپ دیتا ہے۔

وہ بہت باخبر آدمی ہے۔ ناصر زیدی کی طرح، ملک میں کوئی کتاب چھپے۔ کوئی مضمون، کوئی کہانی، کوئی تبصرہ، حق میں یا مخالفت میں، معیاری پرچے میں یا غیر معیاری پرچے میں، ان دو آدمیوں کو علم ہوتا ہے۔

ناصر زیدی کے پاس تو خیر وقت کی فراوانی ہے۔ ادب لطیف کا بارِ گراں نہ ہوتا۔ تو مزید فراوانیاں ہوتیں۔ مگر تاج تو واقعی مصروف آدمی ہے۔ مگر اس پر بھی اتنا باخبر، کہ لمحۂ فکریہ ہے ہم جیسے بے خبروں کے لئے۔

آپ پوچھیں گے ــــ دونوں میں سے سقراط کون اور بقراط کون۔؟ اور شاید یہ سوال بھی، یعنی میرے پاس کیا ثبوت ہے۔ کہ تاج

واقعی سقراط بھی ہے ۔۔ ؟

تو دوستو ۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔۔ اگر آپ کے پاس زہر کا پیالہ موجود ہے ۔ تو سامنے لائیے ۔ یہ پینے سے انکار نہیں کریگا ۔۔۔ بالکل اللہ میاں کی بھیڑ ہے ۔ کسی مضمون نگار نے ان کو گونگے اور بہرے ایڈیٹر کا خطاب دیا ہے ۔

اور یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے ۔۔ !

لیکن اس کے باوجود اس گونگے سقراطیے کا حلقۂ احباب لکھنؤ دہلی، بمبئی اور ڈھاکہ تک پھیلا ہوا ہے ۔ حلقۂ احباب کا ذکر آگیا تو سنیئے ۔ کہ حلقۂ احباب میں نتھو خیرے سے لیکر بڑے بڑے جغادری ادیب اور شاعر اس بے زبان ایڈیٹر کے گشتۂ ناز ہیں حیرت مجھے اُس وقت ہوتی ہے ۔ جب یہ شخص لاہوریوں کے شہر نا پرسال میں قدم رکھتا ہے ۔ اور ہاتھوں ہاتھ اٹھا لیا جاتا ہے ۔ تب مجھے اس پر بے طرح رشک آتا ہے ۔

شاید اس رشک میں کسی حد تک حسد کا شائبہ بھی ہوتا ہے ۔۔ !

اور حسد کیوں نہ ہو ۔ میں جو ربع صدی سے لاہور میں براجماں ہوں ۔ لاہوریوں کا دل جیت نہ سکا اور ادھر اس کی فتوحات کا یہ عالم، کہ پرچم لہراتا ہُوا ہر سال لاہور کو فتح کرتا ہے ۔

بات دراصل یہ ہے ۔ کہ جس شخص نے مردان جیسی زمین میں جہاں گنے اور تمبا کو کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی ۔ ادب کا پودا اگایا کلمۂ تحسین تو نکلے گا یقیناً، کیا بعید کل اس کا قافلہ آگے بڑھے اور ملتان میں خیمہ زن ہو۔ اس طرح آگے ہی آگے،

تاج سعید سے میرے تعلقات کم و بیش پانچ صدیوں سے ہیں ۔ مجھے گمان ہوتا ہے ۔ پانچ صدی پہلے ہم دونوں کا وجود ایک ہو گا ۔ کیونکہ کئی خامیوں کی قدر مشترک کے علاوہ زندگی کے بارے میں ہماری روش بہت ملتی جلتی ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ میں بڑا ملزم ہوں ۔ اور وہ چھوٹا ملزم،

تاج سعید لاہور آتا ہے ۔ تو میرے گھر ٹھہرتا ہے ۔ ان کی بیگم زیتون بانو نے میرے گھر کا نام گوشۂ عافیت رکھ چھوڑا ہے لیکن اب تاج سعید نے لاہور میں کچھ اور ٹھکانے بھی تلاش کر لئے ہیں ۔ اور مجھے چکمہ دیکر ان نئے بسیروں میں جا نکلتا ہے ۔ اس کی وجہ بھی میں نے تلاش کر لی ہے ۔

آپ بھی جاننا چاہیں گے شاید ۔ ؟

بات یہ ہے دوستو ۔ پٹھان ہونے کے باوجود میں مہمان نوازی میں ذرا پھڈی ہوں ۔ اور دعوت شیرازہ کا قائل ۔

خود تاج سے معاہدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ لیکن لاہوریوں نے ان کی زبان پر کچھ نئے ذائقے چسپاں کر دیئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس نے گوشۂ عافیت چھوڑ کر گوشۂ لذّت کی طرف رجوع کیا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر آدمی بھلے مانس ہے۔ اس لئے میں اُسے ٹوکتا نہیں۔ اور منتظر ہوں اس دن کا، جب نو بہ نو ذائقے اس کا ہاضمہ خراب کر دیں گے۔ اور یہ پلٹ کر آواز دے گا۔

" بھائی رحیم گل دعوت شیراز کا اہتمام کرنا۔ میں شام کو آپ کی طرف آؤں گا۔ !"

تب میں اس کو کہوں گا۔۔۔

" اے گوا چی گاں، ویل کم ٹو سویٹ کٹیا۔۔ !"

اور پھر میں اس کو مندرجہ بالا انگریزی کے معنی سمجھاؤں گا۔

کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے۔ تو اُسے بھولا ہُوا نہیں کہتے۔

ایک بات اور بتا تا چلوں۔ تاج سعید نہایت مرنجان مرنج آدمی ہے، سچ پوچھیئے۔ تو مجھے مرنجان مرنج کے لغوی معنی نہیں آتے۔ لیکن جب تاج سعید سے ملتا ہوں۔ تو یوں لگتا ہے۔ کہ مرنجان مرنج کے معنی تاج سعید کے ہوں گے۔

یا یوں کہیئے۔۔۔ کہ تاج سعید سے ملاقات ہو گئی۔ تو گویا جناب

مرنجان مرنج سے ملاقات ہوگئی۔!

اچھائی کی بات یاد آگئی۔ تو سنیئے: تاج سعید واحد ادیب ہے جسے پشاور کے ہر نقطۂ نظر کے ادیب پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ دوستی میں پشاور کے کسی اور ادیب کی دشمنی مول لینے کا احتمال نہیں رہتا۔

تاج کتابوں کا بہت رسیا ہے۔ اگر کبھی خوش قسمتی سے آپ کا مہمان بنے۔ تو لائبریری کے کمرے میں اسے کبھی نہ جانے دیں کوئی کتاب پسند آگئی۔ تو اس کے حسنِ طلب کا وار ایسا خطرناک ہوتا ہے۔ کہ آپ بچ نہیں سکتے ــــ اس کے برعکس اس کے گھر میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں ہیں۔ لیکن اگر کسی کتاب پر نظر بد پڑ گئی۔ تو تاج فوراً تاڑ جائے گا۔ پھر وہ ایسی خوبصورتی سے اس کتاب کی ہسٹری سنائے گا۔ کہ آپ کی رگِ طلب خود بخود دھڑکنا بند کر دے گی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ دنیا کی اس واحد کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش باقی نہ رہے گی ــــ اور تاج دل ہی دل میں خوش ہوگا ــــ یعنی یہ منہ اور مسور کی دال ــــ!

یہ تو ہے ــــ مگر تاج نہایت کھرا اور سچا آدمی ہے۔ آپ اس پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں۔ آپ خط لکھ دیجئے۔ فون کر دیجئے۔ ٹیلیگرام دیجئے ــــ پشاور، باڑہ یا لنڈیکوتل کے لئے کوئی کام، بس پھر گھوڑے بیچ کر سو جایئے۔

اس یقین کے ساتھ گویا آپ کا کام ہو گیا۔

چونکہ معصوم آدمی ہے۔ لہٰذا اپنی فطرت سعید سے مجبور ہو کر وہ یہ اصول اپنے دوستوں پر بھی استعمال کرتا ہے۔ خصوصاً مجھ پر اور اسرار زیدی پر کبھی فون کے ذریعے، کبھی کارڈ بھیج کر، کہ فلاں کام کر دو۔

اور ہم دونوں شاہ جہانی لٹھ، جو خود اپنا کوئی کام بر وقت نہیں کرتے تاج سعید کا کام کر دیتے ہیں ـــــ

لیکن "تنگ آمد بجنگ آمد ـــ ہم نے سوچا۔ کہ یہ شخص جو بلا چوں چرا دوسروں کے احکام کی تعمیل کرتا ہے بظاہر ہے۔ اس کے احکامات تو ماننے ہی پڑیں گے۔ پھر کیوں نہ کچھ دنوں کے لئے اُسے مصروف رکھا جائے اور احکامات کی تعمیل میں خوشگوار رکاوٹ پیدا کی جائے ـــ

چنانچہ ہم نے اس کام کے لئے نثری نظم کے بانی مبانی قبلہ مکانی جناب مبارک جانی کو تیار کیا۔ کہ جا اٹک کے اس پار ـــــ اور سرحدی عقابوں کو اپنے نثری پنجوں سے خون یا تہ کر دے ـــ

اور سُن ـــ ! "تاج سعید کا گھر اس کے لئے موزوں مورچہ ہے" تاج سعید کی بیگم بانو نہ صرف پشتو زبان کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ پشتو زبان کی مشہور شاعرہ بھی ہیں اور یہ کہ، نثری نظم کے بارے میں آپ کے لکھے ہوئے زوردار مضامین سے بے حد متاثر ـــ،

اندھے کو کیا چاہیئے ۔ دو آنکھیں ۔ مبارک احمد نے صاف ستھری چند پاپڑی کیپ رکھی ، اور ناک کی سیدھ عازم پشاور ہوئے ۔ جو ئندہ یا بندہ ۔ اس نے تاج سعید کا گھر دریافت کر لیا ۔ اب بانو تھی ، تاج سعید تھا اور سپوت گجرات ۔!

دونوں میاں بیوی جلد سونے کے عادی ، کہ سحر خیزی کے اسیر ہیں ۔ اور ادھر ریٹائرڈ زندگی گزارنے والا مبارک احمد ، طویل رات کی طرح لمبی بحر میں گفتگو کے مشتاق ۔ ،

یہ اٹھنا چاہیں ۔ وہ اٹھنے نہ دیں ۔ یہ سونا چاہیں ۔ وہ بیٹھنے پر مجبور کریں ۔ میزبانی کا تقاضا ، کہ مہمان کی بات سنیں ۔ مہمان بضد ، کہ ہاتھ آیا ہوا شکار کیسے چھوڑ دوں ۔ میزبان خاموش ، کہ آداب خانہ ملحوظ ، مہمان خوش ، کہ ایسے بے زبان جانور پھر کہاں ملیں گے ۔!

رات ختم ہوئی ۔ بات ختم نہ ہوئی ۔

دوسرے دن تاج سعید کا فون آیا ۔ غصے میں کہہ رہا تھا ۔
" بھائی رحیم گل ، خدا کے لئے اس ٹی ہاؤس کی بلا کو واپس بلا لو ۔!"

میں نے جواب دیا ۔ " ہور چوپو ۔!"

دوسرے دن پھر فون آیا ۔ " بھائی ، وہ بلا ابھی تک یہیں ہے ۔

میں نے کہا ۔ " اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا ۔"

تیسرے دن پھر فون آیا۔ وہی آہ و فریاد، میں نے کہا۔ اسے کہہ دو۔

"خالد احمد آ رہا ہے ۔۔۔!"

شام کو تاج سعید کا فون دوبارہ آیا۔ قہقہہ لگا کر بولا ۔۔۔

"بھاگ گیا۔ خالد احمد کا نام سن کر بھاگ گیا ۔۔۔!"

اس سے اگلے دن مبارک احمد ٹی ہاؤس میں ملا۔ میں نے پوچھا ۔۔۔" دورہ کیسا رہا ۔۔۔؟"

فرمایا۔ "بے حد کامیاب، ایک نظم لکھی ہے، سنیئے ۔"

اے خوبصورت پٹھان دوشیزہ

کواڑ کے پیچھے کیوں ہو گئیں ۔۔۔؟

مجھ سے کیسا پردہ،

میں تو پنجاب سے آیا ہوں۔

میں نے مبارک احمد سے عرض کیا۔" جب آپ نے یہ نظم کہی تو پی کیپ آپ کے سر پر تھی یا ہاتھ میں؟"

مبارک احمد سادگی سے مسکرائے ۔" تُسی بڑے بھولے او۔ بالکل تاج سعید دی طرح ۔"

میں نے پوچھا ۔۔۔" تاج سعید کیسا آدمی ہے ۔۔۔؟"

فرمایا ۔۔۔" بڑا بیبا بندا ہے!"

سیتا جی

مجھ سے کہا گیا۔ کہ اُمّ عمّارہ پر مضمون لکھوں۔ یہ میرے لئے مشکل ہی نہیں۔ "تقریباً ناممکن سی بات تھی۔ بھلا کوئی بتائے۔ کہ صرف ایک ملاقات کے بعد کوئی شخص کسی آدمی پر مضمون لکھ سکتا ہے؟

اور پھر ملاقات بھی بالکل رسمی سی، یعنی میرا اور اُمّ عمّارہ کا ایک مشترک دوست پشاور سے آتے ہیں۔ میرے پاس ٹھہرتے ہیں۔ اُن کے پاس لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اور ان حضرت کو فرداً فرداً سب سے ملنا ہے۔ یہ ماہنامہ "قند" مردان کے مدیر ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ انھوں نے کسی سے افسانہ کسی سے غزل اور کسی سے تنقیدی مضمون حاصل کرنا ہے۔

اس فہرست میں اُمّ عمّارہ کا نام بھی درج ہے۔ میں یہ نام پڑھ کر

چونکتا ہوں۔ بالکل اُسی طرح، جیسے میں اُن کا پہلا افسانہ پڑھ کر چونکا تھا۔
اور پھر یہ بھی کہ امّ عمّارہ کے نام کی ساؤنڈ میری سماعت کو اچھی لگتی ہے
میرا ایک ناول جو امّ عمّارہ کا نام سننے سے پہلے میں نے لکھا تھا۔ اس کا نام
"تن نارا را" تھا۔ یعنی امّ عمّارہ اور "تن نارا را"
چونکہ "تن نارا را" کے نام سے مجھے جذباتی لگاؤ تھا۔ شاید اسی تعلق
سے مجھے امّ عمّارہ کا نام بھی اچھا لگا۔ پھر کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں۔
جو آواز کی تکرار کی وجہ سے ذہن اور زبان پر فوراً چڑھ جاتے ہیں۔
مثلاً ہندوستان کا ترچناپلی، نیپال کا کٹھمنڈو، اور پاکستان کا چھانگا
مانگا۔

اگرچہ اس فہرست میں امّ عمّارہ کے علاوہ دوسری خواتین کے
نام بھی درج تھے لیکن میں نے تاج سعید سے کہا — جس دن امّ عمّارہ
سے ملنے جاؤ گے — مجھے بھی ساتھ لے چلنا"
اُس نے کہا — "ضرور — !"

امّ عمّارہ کو میں اس ملاقات سے پہلے رائٹرز گلڈ کی ایک میٹنگ
میں دیکھ چکا تھا۔ وہ جوگیا رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئی تھیں۔ اس
میٹنگ میں یہ واحد خاتون تھیں۔ جو بڑے بڑے جغادری ادیبوں میں
بیٹھی فرفر بول رہی تھیں — الفاظ ان کے منہ سے اس طرح نکل رہے تھے

جیسے شین گن سے گولیاں ۔

یہ پُر اعتماد لہجہ دیکھ کر میں نے کسی سے سرگوشی کی "یار یہ خاتون کون ہیں ؟"

جواب ملا ۔" امّ عمارہ ۔ !

" اچھا، تو یہ ہیں امّ عمّارہ ۔ !" میں نے دل میں کہا۔ اس کے بعد کبھی کبھار مال روڈ پہ یا کسی ادبی اجتماع میں ان کو دیکھتا۔ وہی سادہ سی ساڑھی، وہی گول پُروقار چہرہ، اور وہی چاندی کے اصلی سکّے کی طرح چھناکے کا لہجہ ۔

چونکہ تعارف نہیں تھا۔ اس لئے خواہش کے باوجود، اُن سے بات نہ ہو سکی۔

جب تاج سعید نے یہ موقع فراہم کیا۔ اور ہم ان کے گھر پہنچے۔ تو وہی جو گیا ساڑھی پہنے امّ عمارہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھی ۔۔۔ سیدھا سادہ گھر، بالکل امّ عمارہ کے مزاج کی طرح، امّ عمّارہ کی سادگی اور خلوص دیکھ کر مجھے سیتا جی کا بن باس یاد آ گیا۔ وہ دو بار بن باسی ہوئی تھیں۔ امّ عمّارہ بھی دو بار بن باس ہوئیں۔ ایک بار خوشی سے، دوسری بار ناخوشی سے ۔ سیتا جی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلی بار رام کے ساتھ اپنی مرضی سے بن باس لیا۔ دوسری بار راون نے زبردستی

اٹھالیا ___ امّ عمارہ پہلی بار بن باس ہوئی۔ تو چھوٹی سی بچی تھیں مگر پاکستان زندہ باد کے معنی سمجھتی تھی ۔ لہٰذا خوشی خوشی نعرے لگاتی ہوئی جنوبی ہند سے مشرقی پاکستان پہنچی ___ اپنے بھائیوں کے پاس، لا الٰہ کا نعرہ لگانے والوں کے پاس، یہ ایسا جذباتی نعرہ تھا۔ کہ ماضی کا سارا شعور ذہن سے نکل گیا۔ پرانا گھر بھول گیا۔ نیا گھر بسا لیا۔ وہی نا ___

ہر ملک ملک ما است کہ ملکِ خدائے ما ست ۔ !

مگر راون کس صدی میں پیدا نہیں ہوتے ۔ بات ایک ہزار سال پہلے کی ہو، یا تین ہزار سال پہلے کی، یا ایک ہزار سال بعد کی ___ یہ دھرتی سیتا کو جنم دیتی ہے ۔ تو راون کو بھی پروان چڑھاتی ہے کہ یہ قانونِ فطرت ہے۔

امّ عمارہ بھائیوں کے دیس آئی، بھائی کے ساتھ آئی۔ مگر قانون فطرت نہ بدلا ۔ راون نے پھر جنم لے لیا تھا۔ اس راون کے ایک کروڑ سر تھے ۔

اس راون نے امّ عمارہ کو مشرق سے اٹھا کر شمال مغرب میں لا پھینکا ۔ اس سرزمین پر، جہاں نور جہاں جیسی تاریخ ساز ہستی مدفن ہے اور اس کے مقبرہ پر یہ شعر کندہ ہے۔

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ہاں تو دوستو ـــ میں ذکر کر رہا تھا۔ اس واحد ملاقات کا ـــ
جو امّ عمّارہ کے گھر ہوئی تھی ـــ ہم نے وہاں چائے پی۔ باتیں ہوئیں
ادب کی، ادیبوں کی، وہ جو خول چڑھا لیتے ہیں لوگ، افسانوں میں
کچھ نظر آتے ہیں۔ باتوں میں کچھ۔ اُن کی قمیص اُتار لو۔ تو اندر سے سڑی
ہوئی بنیان نکلتی ہے۔ مگر اس کے برعکس امّ عمّارہ تو بالکل اپنے افسانوں
کا جیتا جاگتا کردار نکلیں۔ جو دل میں تھا۔ وہ زبان پر، اور جو زبان پر تھا۔ نوک
قلم پر، اور جو نوک قلم پر تھا۔ افسانہ بن گیا۔!

تو یہ تھا اس خاتون افسانہ نگار سے میری پہلی ملاقات کا فسانہ۔

اچھے لوگوں سے ملنے پر جو مسرت ملتی ہے۔ وہ اس گھر کی فضا میں رچی بسی
تھی۔ میں خوش تھا۔ کہ تاج سعید مجھے صحیح جگہ پر لایا تھا ـــ

کچھ عرصہ بعد "قند" کا ممتاز شیریں نمبر چھپا۔ میری خوش قسمتی یا بد قسمتی
یہ فیصلہ میں اپنے سامعین پر چھوڑتا ہوں۔ "تاج سعید نے مجھے ایک کی بجائے
دو پرچے بھیج دیئے۔ ان میں سے ایک پرچہ امّ عمّارہ کو پہنچانا تھا۔ ان دنوں
میں کسی فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ اپنا پرچہ میں نے تکیئے کے نیچے رکھا۔
کہ وقت ملے۔ تو پڑھتا رہوں۔ دوسرا پرچہ الماری میں رکھ دیا۔ کہ فرصت

ملنے تو پہنچا آؤں۔ مگر یہ پرچہ الماری میں کیا رکھا۔ کہ بس رکھا ہی رہ گیا۔
میں اسے بالکل بھول گیا ـــــ
چھ سات مہینے بعد کسی کتاب کی تلاش میں الماری کھولی۔ تو "قند" کا یہ شمارہ بھی مل گیا۔ جس پر تاج سعید کے ہاتھ سے امّ عمارہ لکھا ہُوا تھا۔
میں اپنی غیر ذمہ داری اور بھول پر بے حد شرمندہ ہُوا۔ مگر جرأت نہ ہوئی کہ پرچہ پہنچا دوں۔ سچ کہہ دوں اور معذرت کر لوں ـــــ سوچا، امّ عمارہ کو کیا پتہ کہ اس کا پرچہ میرے پاس آیا ہے۔ اور پھر تاج سعید بھی بھول بھال گیا ہو گا۔ لہٰذا خاموشی بہتر ہے۔
مگر یہ منفی سوچ کام نہ آئی۔ کچھ عرصہ بعد تاج سعید پھر لاہور آیا۔ اور حسبِ معمول سب دوستوں سے ملا۔ میرے پاس آیا۔ تو شکووں اور شکایات کا دفتر اٹھائے ہوئے ـــ امّ عمارہ نے اس کی جو خبر لی تھی۔ اس نے وہ کسر یہاں پوری کر دی ـــ
میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ معذرت کا وقت گزر گیا تھا۔ بس ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔ قصہ یہیں ختم ہو جاتا۔ تو صبر شکر کر لیتا۔ مگر یہ معاملہ تو شبِ ہجراں کی طرح طویل ہوتا چلا گیا۔ وہ جو کہتے ہیں: کہ ایک جھوٹ سو جھوٹوں کو جنم دیتا ہے ـــ بس وہی ہوا۔
بھلا اب میں امّ عمارہ کا سامنا کیونکر کر سکتا تھا۔

کوئی ادبی اجتماع ہو۔ اس میں اُمّ عمّارہ نہ ہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا اور جہاں اُم عمارہ ہو۔ وہاں میں کس طرح بیٹھ سکتا تھا۔۔ اگر اس نے پرچہ نہ پہنچانے کا شکوہ کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ یہی نا کہ نہ چلّو بھر پانی ہو گا اور نہ مجھے ڈوب مرنے کا موقع ملے گا۔

چنانچہ کافی عرصہ اس عذاب میں کٹا۔ کہ اگر کسی ادبی محفل میں جانا ہوتا تو عمدًا دیر سے پہنچتا۔ سب لوگ بیٹھ جاتے۔ تو میں نہایت احتیاط سے کسی گوشے میں سے سر نکال کر ساری محفل کا جائزہ لیتا۔۔۔ امّ عمّارہ بیٹھی ہوتیں۔ تو دبے قدم واپس ہو جاتا۔ وہ موجود نہ ہوتیں۔ تو چھاتی تان کر فرنٹ رو میں پہنچنے کی کوشش کرتا۔

کبھی کبھی سوچتا۔۔ یہ عیسائی لوگ اعتراف گناہ کر کے کتنے ہلکے پھلکے ہو جاتے ہوں گے۔ معذرت کتنی اچھی منطق ہے۔ غلطی ماننے میں کتنی بڑائی ہے۔۔۔

ایک معذرت نہ کر کے میں نے کیسی کیسی اذیتوں کا سامنا کیا ہے۔ اور کیسے پیارے پیارے دوستوں کو کھویا ہے۔

شاید یہی وجہ تھی۔۔۔۔۔ کہ جب پروفیسر گلزار وفا چودھری نے ام عمارہ کی شخصیّت پر مضمون لکھنے کو کہا۔۔ تو امّ عمارہ کی شخصیّت پر کچھ نہ جاننے کے باوجود میں فورًا آمادہ ہو گیا۔ کہ اعتراف گناہ

کے اس زرّین موقع سے فائدہ اٹھاؤں ـــــــ دو سال بعد سہی میں سٹیج پر آگیا ہوں۔

اور "قند" کا ممت "زشیریں نمبر" "قند مکرّر" کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور دو سال کا جو سود در سود بنتا ہے۔ اس کے بدلے اپنے دو ناول "تن تارا را" اور "پیاس کا دریا" الگ پیش کرتا ہوں۔!

تاج سعید نے مجلّہ قند کے کئی خصوصی شمارے مرتّب کئے جو اپنی افادیت کے لحاظ سے بے مثل ہیں لیکن ان میں سے تین شمارے

- ڈرامانمبر
- مجید امجد نمبر
- ممتاز شیریں نمبر

ایسے ہیں جو اردو ادب میں لازوال حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی قدروقیمت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ مذکورہ تینوں خاص نمبر ایک عرصہ سے نایاب ہیں۔ لہذا ان تینوں یادگار شماروں کو اب نئی سج دھج کے ساتھ تین خوبصورت کتابوں کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

۱۔ طیف تمنا — ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۔ مجید امجد، شخص و شاعر — ناشر: آئینۂ ادب، لاہور
۳۔ حرف شیریں — ناشر: مکتبۂ عالیہ، لاہور

دھڑکنیں

پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ان کے ادب اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ عوام کے دل جو ایک ہی آہنگ پر دھڑکتے ہیں۔ ایک ہی تال پر رقص کرتے ہیں اور ایک ہی جذبے سے سرشار ہیں۔ ان دھڑکنوں اور ان جذبوں کو افسانہ نگار کے قلم نے لفظوں کی صورتیں عطا کی ہیں اور ان میں پاکستانی دھرتی کی خوشبو رچی بسی ہے ——— اپنی زمین کے ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں اور سنگریزوں کو "دھڑکنیں" کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب

کی لازوال کہانیاں

مرتب

تاج سعید

مکتبۂ ارژنگ (ظہیر آباد) پشاور

شیشم کا پتّا کے بعد

زیتون بانو کے پشتو افسانوں
کے تراجم کا دوسرا مجموعہ

سرحد کی معاشرت کی جو عکاسی اور نمائندگی زیتون بانو نے کی ہے وہ فکشن کی دنیا میں قطعی طور پر منفرد ہے ـــــ احمد ندیم قاسمی

زیتون بانو کو وقت کا بہت شدید احساس ہے. اس کے اندر کہیں یہ جذبہ جاگتا رہتا ہے کہ وقت ظالم ہے اور اس کے ہاتھوں کئی گناہ سرزد ہوتے ہیں.

ـــــ بانو قدسیہ

زیتون بانو معاشرت کی زندہ حقیقتوں کی افسانہ نگار ہیں. انسانی جذبات و کیفیات کی طرح ان کے افسانے بھی رنگا رنگ اور بوقلموں ہیں ـــــ میرزا ادیب

بانو کی کہانیاں ایسی نہیں کہ وقت ان پر ہل چلا سکے. یہ ایسے انسانی جذبات و نفسیات کی کہانیاں ہیں جن کی حیثیت دائمی ہے. ـــــ خاطر غزنوی

زیتون بانو معاشرے کے باطن تک اتر کر، اس کے وجود کا ایک حصّہ بن کر حقیقت نگاری کا جادو جگاتی ہیں. ـــــ فتح محمد ملک

زیتون بانو کے افسانوں میں جہاں اس کے اپنے علاقے کی خوشبو ہے. وہاں وہ تپش بھی ہے جو نئے عہد کی حرارت سے پرانے سماجی ڈھانچے کے پگھلنے سے پیدا ہو رہی ہے. ـــــ منصور قیصر

مکتبۂ عالیہ، لاہور

"شبِ رفتہ" کے بعد مجید امجد نے اظہار کے نئے قرینوں کو آزمایا، فکر کے نئے زاویوں کو تراشا اور ہیئت کے کئی نئے تجربے کیے۔ مجید امجد کے جاوداں تجربات کا ایک لازوال انتخاب تاج سعید نے کیا ہے۔



مجید امجد کی شاعری کا دوسرا نمائندہ مجموعہ

خوبصورت گٹ اپ

قیمت ۱۵/۰ روپے

خاکہ نگاری اردو ادب کی نہایت کم عمر اصناف میں سے ہے ، مگر رشید احمد صدیقی ، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل ، احمد بشیر ، رحیم گل ، عطاء الحق قاسمی اور گلزار وفا چوہدری کی فنکارانہ عطاؤں نے اسے نہ صرف کم مایگی کے الزام سے محفوظ کر لیا ہے بلکہ اُسے غیر معمولی پر مایگی سے ہمکنار کر دیا ہے !

رحیم گل کی خاکہ نگاری کا رنگ محل سائنسی انداز نظر اور فنکارانہ اسلوب نگارش کے دلاویز سنگم پر استوار ہے - اول الذکر خصوصیت انہیں زیر مطالعہ شخصیت کی سیرت کے خد و خال نمایاں کرنے کے دوران میں ، مبالغہ اور غلو سے تحفظ فراہم کرتے ہوئے بڑے حقیقت پسندانہ توازن کے ساتھ ، اس سے کرداری اوصاف پرمحیط ہونے میں مدد دیتی ہے اور مؤخر الذکر خصوصیت ان کی کاوش کوذاتی واقعات و احوال کی جامد ، بنجر اور بے رنگ کھتونی کا روپ اختیار کرنے سے بچاتے ہوئے ایک سیال ، شاداب اور ہفت رنگ مرقع میں ڈھلنے کی سعادت بخشتی ہے - یہ انہیں خصوصیات کے قران السعدین کا ایک ضمنی مگر نہایت وقیع فیضان ہے کہ رحیم گل کی خاکہ نگاری کو خاکہ اڑانے ، فقرہ داغنے یا پھبتی کسنے سے کوئی علاقہ نہیں ، بلکہ اس کے برعکس ان کے ہاں اس شگفتہ بیانی کے بے محابا اظہار کا احساس ہوتا ہے ، جو زیر نظر شخصیت سے ان کے سمندر کی طرح وسیع اور گہرے پیار کی آئینہ دار ہوتی ہے ـ ـ ـ ظاہر ہے کہ یہ وسعت اور گہرائی رحیم گل کی اس یگانہ اور منموہنی شخصیت کا کرشمہ ہے ، جو خود ایک عریض و عمیق سمندر سے مماثل ہے ۔

عارف عبدالمتین

۳۱ اکتوبر ۷۹ء